علامہ اقبالؒ اور غایتِ پاکستان

مُظفّر حُسین

علامہ اقبال اور غایت پاکستان

مظفر حسین

آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس
۷ فرینڈز کالونی، ملتان روڈ، لاہور

اشاعت	:	بار اول ۱۹۹۷ء
تعداد	:	۱۲۰۰
کمپوزنگ	:	پرل کمپوزنگ سنٹر پیسو راما، لاہور
مطبع	:	میٹرو پرنٹرز لاہور
شائع کردہ	:	آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس
		۷ فرینڈز کالونی ملتان روڈ، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

کیا ابھی وقت نہیں آیا؟

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ کیا اس نے ان کی تدابیر کو اکارت نہیں کر دیا؟ اور ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیئے جو ان پر پکی ہوئی مٹی کی کنکریاں پھینک رہے تھے۔ پھر ان کا یہ حال کر دیا جیسے جانوروں کا کھایا ہوا بھوسا۔" (ترجمہ سورہ فیل۔ تفہیم القرآن، سید ابوالاعلیٰ مودودی)

"تم نے نہیں دیکھا؟"—— کے مخاطب آج ہم ہیں تو ہمیں غور کرنا چاہیے کہ اس سورۃ مبارکہ میں ہمارے لئے کیا سبق ہے؟

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنا احسان یاد دلا رہا ہے کہ دیکھو تمہارے "مرکز محسوس" خانہ کعبہ کی حفاظت ہم نے ایک ایسے وقت میں بھی کی جب مکہ کے گمراہ اور بد عمل لوگوں نے اسے ایک بتکدہ میں تبدیل کر رکھا تھا، اور خدا کے مقدس و مطہر گھر میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔

عقل کہتی ہے کہ ان گمراہ اور بد عمل لوگوں کی بد کرداری کی انہیں سزا دی جاتی۔ ان پر خدا کا غضب ٹوٹتا اور خانہ کعبہ کو بتکدہ شمار کرتے ہوئے ابرہہ کے ہاتھوں مسمار کر دیا جاتا—— لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس گھر کی حفاظت اس لئے فرمائی کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس کی بنیادیں خانہ خدا کے طور پر اٹھائی تھیں اور مستقبل میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آرزو کے مطابق اسے امت مسلمہ کا قبلہ قرار پانا نیز بنی نوع انسان کے لیے امن و سلامتی کا عالمی نشان بننا تھا۔

کیا ہم نے دیکھا نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کی حفاظت کے لیے افغانستان کو وادی محسر کی طرح روس جیسی عالمی طاقت کا قبرستان بنا دیا۔ اس لیے کہ پاکستان کی بنیاد کلمہ طیبہ **لاالٰہ الا اللہ** پر اٹھائی گئی ہے اور مشیت ایزدی اسے ایک ایسے عظیم مقصد کی تکمیل کے لئے معرض وجود میں لائی ہے جس سے بنی نوع انسان کا مستقبل وابستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اپنے مقصد کی تکمیل کی خاطر خود پاکستان کی بقاء کی ضامن ہے۔ اور جس اعلیٰ مقصد کے لئے اسے وجود بخشا گیا ہے اسے بہرحال پورا ہو کر رہنا ہے۔

اگر ہمارا سدا مہربان خدا ہماری غفلتوں، کوتاہیوں اور بد عملیوں کے باوجود پاکستان کی حفاظت اور نگہبانی کر رہا ہے تو کیا نصف صدی بعد بھی وقت نہیں آیا کہ ہم ان مقاصد پر توجہ دیں جن کی تکمیل کے لیے یہ نعمت عظمیٰ ہمیں بخشی گئی ہے؟

حرف اول

پاکستان کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر گولڈن جوبلی منائی جا رہی ہے لیکن یہ ایسی جوبلی نہیں جسے علامہ اقبال کے الفاظ میں "عید آزاداں شکوہ ملک ودیں" کا نام دیا جا سکے۔ پاکستان کی فضا میں آج افسردگی زیادہ اور امید افزا خوشی کم ہے اور شاید اسی بنا پر ہمارے ایک سابق وزیراعظم نے اس گولڈن جوبلی کو بلیک جوبلی کا نام دیا ہے۔

بہرحال ہم مایوس نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے اکثر سیاستدانوں اور ان کے شرکائے کار نے پاکستان کو بڑی بیدردی سے لوٹا ہے اور اسے نیم جان کر رکھا ہے لیکن اس کے باوجود وطن عزیز میں رسم وفا ختم نہیں ہوئی، پاکستان سے ٹوٹ کر محبت کرنے والے وفاکیش لوگ ابھی باقی ہیں جو اس بلیک جوبلی کو بلیک بیوٹی سمجھتے ہوئے وطن عزیز پر دل و جان سے فدا ہیں اور اس پر جان نچھاور کرنے کو تیار ہیں۔ درحقیقت پاکستان کے تخلیقی نقوش میں ایسی حسن و دلکشی رکھی گئی ہے جسے ہم اس کے روشن چہرے پر اپنی پچاس سالہ بداعمالیوں کی کالک مل کر بھی دھندلا نہیں سکے۔

ہندوستان کے انتہائی مایوس کن حالات میں علامہ اقبال نے جب پیر رومی سے شکایت کی تھی:

ہند میں اب نور ہے باقی نہ سوز
اہل دل اس دیس میں ہیں تیرہ روز

تو پیر رومی نے انہیں نصیحت کی تھی:

کار مرداں روشنی و گرمی است
کار دوناں حیلہ و بے شرمی است

مایوسی کفر ہے اور امید ہی کا دوسرا نام ایمان ہے۔ سورہ العصر میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تیرہ و تار فضاؤں کو ایمان کی روشنی اور عمل کی گرمی سے روشن اور منور رکھا جائے اور حالات خواہ کتنے ہی نامساعد کیوں نہ ہوں لوگوں کو مشکلات میں صبر اور حق پر استقامت کی استقلال کے ساتھ تلقین کرتے رہنا چاہیے۔

علامہ اقبال نے اپنے عہد ساز خطبہ الہ آباد میں ہندوستان میں اسلام کی بنیاد پر ایک الگ ملک کا تصور پیش کیا تو چار سو پھیلی ہوئی مایوسیوں سے اپنا دامن خیال جھٹکتے ہوئے بڑے زوردار الفاظ میں اپنے اس ایقان کا اظہار کیا تھا کہ اسلام کی تقدیر اس کے اپنے ہاتھ میں ہے جسے کسی دوسری تقدیر کے ہاتھ میں دے کر نگوں سار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تقدیر کیا ہے؟ اسی تقدیر کو سمجھنے کے لئے موجودہ کتابچہ "علامہ اقبال اور غائت پاکستان" نوجوان نسل کے لئے لکھا گیا ہے۔ خدا

کرے وہ مدعا پورا ہو جو یہ کتابچہ لکھنے کا محرک بنا۔

راقم نے پہلے بھی پاکستان اور اسلام کے بارے میں علامہ اقبال کے افکار و نظریات کی وضاحت کے لئے چند کتابچے لکھے تھے جن کا ایک محدود حلقے میں چرچا ہوا اور پسند اور ناپسند دونوں طرح کا رد عمل سامنے آیا۔ کئی دوستوں نے مجھے ناصحانہ انداز میں کہا کہ علامہ اقبال اور مولانا مودودی میں کوئی اختلاف نہیں اور کلچرل اور آئیڈیالوجیکل طریقہ ہائے کار کے حوالے سے ان میں تفریق کر کے میں ایک کار بے خیر میں پڑ گیا ہوں۔ بعض احباب نے طنز و تعریض کے نشتر چلائے اور رسائل و جرائد میں تبصروں کی صورت میں اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور بعض کرمفرماؤں نے دھمکی آمیز خطوط لکھے جن پر اپنا نام اور پتہ لکھنا مناسب خیال نہیں کیا۔ خیر اس قسم کے کاموں میں ایسا تو ہوتا ہی ہے لیکن کچھ ایسی تعجب انگیز باتیں بھی میرے علم میں آئیں جو چونکا دینے والی تھیں۔ منصورہ کی مسجد میں ایک عالم دین نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ:

> "آپ کے بھیجے ہوئے کتابچے مجھے ملے ہیں اور میں نے ان کا مطالعہ کیا ہے۔ میری ایک بات پلے باندھ رکھئے۔ آپ شوق سے اقبال کا مطالعہ کیا کریں لیکن دین آپ کو فقط مولانا مودودی کے ہاں ملے گا۔"

لیکن اس سے کہیں زیادہ حیران کن رد عمل ایک ایسے صاحب علم دوست کا تھا جن کے متعلق میں اونچی رائے رکھتا ہوں۔ انہوں نے جس قسم کا رد عمل ظاہر کیا اس کا مجھے وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے علامہ اقبال کے بارے میں مجھے لکھا:

> "مجھے اپنی کم علمی اور نالائقی کا اعتراف ہے کہ اس لحاظ سے نہیں دیکھا اور پڑھا کہ وہ ایک دینی مفکر ہیں جو غلبہ دین کے لئے ایک مربوط فکر اور باقاعدہ حکمت عملی رکھتے ہیں .... بلکہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ مرحوم یوسف گورایا نے ایک دفعہ نوائے وقت میں اقبال کو مجتہد ثابت کرنے کی کوشش کی تھی تو میں نے ان کا خاصا تعاقب کیا تھا۔"

یہ صاحب ملک کی جانی پہچانی علمی شخصیت ہیں۔ پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں اور دینی اور سیاسی موضوعات پر ان کے گرانقدر مقالات کو قومی اخبارات میں ہمیشہ نمایاں طور پر شائع کیا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کی تحریر سے مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ مولانا مودودی کے سیاسی علم کلام نے اس ملک میں فکر اقبال کی اہمیت کو ختم کرنے میں کیا کردار ادا کیا ہے، لیکن اس کے باوجود عام طور پر اکثر لوگ مولانا مودودی کو علامہ اقبال کا فکری جانشین ہی تسلیم کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مسئلہ قومیت کے موضوع پر مولانا مودودی نے علامہ اقبال کی ہمنوائی میں جو قلمی جہاد کیا وہ ناقابل فراموش ہے اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ نظریہ اخلاق کے اعتبار سے ان دونوں میں بڑی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ دونوں "صحیح اور قوی" مومن کی تلاش میں ہیں۔ لیکن سیاسی حکمت عملی کے معاملے میں دونوں میں بعد المشرقین ہے۔

مولانا مودودی نے سیاست میں جس آئیڈیا لوجیکل طریق کار کے مطابق جدوجہد کی اس کے

نتائج آج سب کے سامنے ہیں۔ میرا یہ خیال ہے کہ موجودہ حالات میں علامہ اقبال کا کلچرل طریق کار زیادہ نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔ لیکن ہماری سیاسی سوچ پر مولانا مودودی کے علم کلام کا اس قدر غلبہ ہے کہ جو لوگ مولانا مودودی سے اختلاف رکھتے ہیں وہ بھی اس کے سحر میں گرفتار ہیں۔ چنانچہ میں نے مولانا مودودی کے سیاسی نظریات پر از سر نو غور اور علامہ اقبال کے سیاسی افکار کی وضاحت کے لئے چند کتابچے لکھے جو پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس نے شائع کئے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ شاید میری اس کاوش سے کوئی مفید نتیجہ برآمد ہو۔ میری کنٹری بیوشن فقط اتنی ہے کہ علامہ اقبال کے سیاسی افکار و نظریات جو مولانا مودودی کے سیاسی علم کلام کے غلبے کی وجہ سے یکسر فراموش کر دئے گئے تھے میں نے انہیں طاق نسیاں سے نکال کر عوام کے سامنے دوبارہ پیش کر دیا ہے۔ اس کے سوا نہ مجھے کوئی دعویٰ ہے اور نہ ہی اس "کار عاشقی" سے کوئی غرض وابستہ۔ البتہ ہر مسلمان کی طرح یہ آرزو اور تمنا ضرور رکھتا ہوں کہ بارگاہ ایزدی میں میری یہ کاوش قبول ہو۔

درحقیقت میں علامہ اقبال پر ایک کتاب لکھ رہا تھا جس کا عنوان "پاکستان' روحانی جمہوریت اور نیا عالمی نظام" ہے۔ قریباً تین چوتھائی کام مکمل ہو چکا تھا لیکن بیچ میں کچھ مشکل مقامات ایسے آ گئے جن کے بارے میں مجھے ابھی پوری طرح سے شرح صدر حاصل نہیں۔ مزید جستجو اور مطالعہ جاری ہے انشاء اللہ بشرط زندگی اور صحت سال رواں کے آخر تک یہ کام مکمل ہو جائے گا۔ اسی دوران پاکستان کی گولڈن جوبلی کے حوالے سے خیال آیا کہ علامہ اقبال کے اصل مشن اور کام سے پاکستان کی نئی نسل کو متعارف کرانے کی ضرورت ہے۔ اس لئے "علامہ اقبال اور غائت پاکستان" کے عنوان سے یہ کتابچہ تحریر کیا گیا۔

میرے واجب الاحترام احباب جناب ڈاکٹر وحید قریشی' جناب پروفیسر محمد منور مرزا' جناب احمد بشیر اور جناب اکرام رانا کا تقاضا ہے کہ میں اقبال کے بارے میں اپنے تمام کتابچوں کو یکجا شائع کروں۔ ان احباب کی حوصلہ افزائی کا میں بے حد شکر گزار ہوں اور جب بھی اس غرض کے لئے مالی وسائل دستیاب ہو گئے یا کسی اشاعتی ادارے نے حامی بھری تو "علامہ اقبال اور ہمارا مستقبل" کے عنوان سے انشاء اللہ انہیں شائع کر دیا جائے گا۔ سردست "علامہ اقبال اور غائت پاکستان" کی اشاعت کی صورت میں گولڈن جوبلی کے اس موقع پر ادارہ آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس نے ایک چراغ روشن کر کے تقریبات میں اپنا حصہ ڈالنے کی سعی کی ہے۔

مظفر حسین
اکیڈمک اینڈ ایڈمنسٹریٹو ڈائریکٹر
آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس
۷۔ فرینڈز کالونی' ملتان روڈ' لاہور

یکم اگست ۱۹۹۷

پاکستان کی فکری اساس کی اہمیت
بانی پاکستان کی نظر میں

"اگر میں ہندوستان میں اسلامی ریاست کے قیام تک زندہ رہوں اور مجھ سے کہا جائے کہ تم اقبال کی تصانیف (یعنی فکر اقبال) یا اسلامی ریاست میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کر لو تو میں اقبال کی تصانیف کا انتخاب کروں گا۔"

قائد اعظم محمد علی جناح

(ماخوذ: اطراف اقبال از ملک حسن اختر' میری لائبریری لاہور ۱۹۷۲)

پاکستان کی فکری اساس کا اہم ترین نکتہ
مصور و مفکر پاکستان کے الفاظ میں

کل ساحل دریا پہ کہا مجھ سے خضر نے
تو ڈھونڈ رہا ہے سم افرنگ کا تریاق؟
اک نکتہ مرے پاس ہے شمشیر کی مانند
برندہ و صیقل زدہ و روشن و براق
کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

علامہ اقبال

(ماخوذ: ضرب کلیم: کافر و مومن)

علامہ اقبال اور غایت پاکستان

علامہ اقبال کو مصور پاکستان تو تسلیم کیا جاتا ہے لیکن ان کے تصور پاکستان کو سمجھنے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے۔ اس بات کو سبھی لوگ جانتے اور مانتے ہیں کہ ہندوستان میں سب سے پہلے علامہ اقبال نے ہی وطن کی بنیاد پر قومیت کی نفی کی' عمر بھر اس موقف پر شدت سے اصرار کیا کہ مسلمان محض اپنے عقیدے کی بنیاد پر ایک قوم ہیں' اسی اصول کی روشنی میں وہ مسلمانوں میں ' اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے' کا شعور پختہ کرتے رہے اور ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے ایک الگ ریاست کا مطالبہ پیش کیا جو آج دنیا کے نقشے پر پاکستان کے نام سے قائم ہے۔ لیکن کیا علامہ اقبال کی ساری فکری کاوش اور جدوجہد فقط ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک خطہ ارضی حاصل کرنے تک محدود تھی جسے دنیا آج پاکستان کے نام سے پکارتی ہے؟

علامہ اقبال کی زندگی کے حالات پر غور کیا جائے تو ذہن اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔

ہم اس بات پر توجہ نہیں دیتے کہ علامہ اقبال نے پہلی بار جب ۱۹۰۷ء میں اپنی قوم کی رہنمائی کا عزم کیا اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی خبر دی تو اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے ایک الگ ریاست کا کوئی منصوبہ ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھا۔ البتہ اس وقت وہ مغربی تہذیب کی خودکشی کی پیشگوئی اور امت مسلمہ کی عظمت رفتہ کی باز آفرینی کے نغمے الاپ رہے تھے۔ کیا یہ باتیں صرف ہندوستان کی سیاست سے تعلق رکھتی تھیں اور مقامی سیاست تک محدود تھیں؟ نہیں۔ بلکہ ایسا نظر آتا ہے کہ ان باتوں کا تعلق ہندوستان سے کہیں زیادہ عالمی مسائل سے تھا۔ علامہ اقبال نے جب کبھی ہندوستان کی سیاست کے بارے میں کوئی بات کی ہے ہمیشہ ہندوستان کے محدود تناظر کے بجائے وسیع تر عالمی تناظر میں کی ہے۔ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ انسانی

تاریخ میں جب بھی کسی سیاسی یا فکری رہنما نے اپنی قوم کے لوگوں کو پکارا تو سب سے پہلے ان کے سامنے اپنا نصب العین یا منصوبہ ہی رکھا اور انہیں اس کے لئے جدوجہد کرنے کی دعوت دی۔ علامہ اقبال نے مارچ ۱۹۰۷ء میں اپنی قوم کی رہنمائی کا عزم کیا لیکن ہندی مسلمانوں کے سامنے ایک علیحدہ ریاست کی تجویز دسمبر ۱۹۳۰ء میں پیش کی تو کیا یہ خیال کیا جائے کہ علامہ اقبال نے تئیس سال تک اپنی قوم سے اپنا نصب العین یا منصوبہ مخفی رکھا؟ صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ ریاست کا قیام ان کے نصب العین کے عملی پروگرام کا حصہ تو بنا لیکن یہ ان کا اصل ہدف نہیں تھا بلکہ ہدف کے حصول کا محض ایک ذریعہ تھا۔ ان کا نصب العین آفاقی نوعیت کا تھا اس لئے اگر ہم علامہ اقبال کو مصور پاکستان تسلیم کرتے ہیں تو غائت پاکستان کو بھی اسی آفاقی نصب العین کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس نصب العین کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم علامہ اقبال کی عمر بھر کی فکری جدوجہد کا تفصیلی جائزہ لیں اور دیکھیں کہ اس کا محور و مرکز کیا ہے۔ اپنے زمانہ طالب علمی میں قیام انگلستان کے دوران علامہ اقبال نے مغربی تہذیب کا قریبی مشاہدہ کیا تو ان پر یہ ظاہر ہوا کہ یہ تہذیب اپنی ظاہری چکا چوند کے باوجود اندر سے بالکل کھوکھلی اور قریب المرگ ہے۔ سیاست کی مذہب سے جدائی کے باعث اہل مغرب کی سیاست کا رشتہ رنگ، نسل، زبان اور علاقائی تعصبات سے قائم ہو گیا ہے جس کے نتیجے میں دنیا میں معاشی استحصال اور سیاسی استعمار کو فروغ ملا ہے۔ اسی طرح خدا سے سائنس اور ادب کا رشتہ منقطع ہونے کے باعث انسان کے اندر دلسوزی، دردمندی، انسان دوستی اور غمگساری کے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے ہیں اور اخلاقی اقدار کی دلوں میں کوئی وقعت باقی نہیں رہی۔ ان تبدیلیوں کے باعث یورپ میں جو تہذیب پروان چڑھی اس میں بیدردی، سنگدلی، خودغرضی اوز لذت کوشی کی اقدار اور انسانیت کش فکر اور اخلاق سوز رویوں کو فروغ ملا جو کسی بھی تہذیب میں خودکشی کی علامات قرار دی جا سکتی ہیں۔ ان حالات میں علامہ اقبال نے عصر حاضر میں اسلام کے تہذیب ساز اور تہذیب آفریں امکانات کا جائزہ لیا جو انہیں بے حد روشن نظر آئے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ دنیا ایک نئے عالمی نظام کی تلاش میں ہے اور وہ اسلام ہی ہے جو توحید کی بنیاد پر دنیا کو وحدت

آدم کا تصور دے کر ایک نیا جہان تعمیر کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہے۔ یہ حقیقت ان پر ایک کشف کی صورت میں القا ہوئی اور آپ نے اپنی پوری زندگی اسی نئے جہان کی تعمیر کے لئے وقف کر دی۔ چنانچہ آپ نے تمام اقوام عالم کو بالعموم اور امت مسلمہ کو بالخصوص اس پیغام کا مخاطب بنایا اور اپنی شاعری کے ذریعے اسلام کی انہی تعلیمات کے ابلاغ کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا جو رنگ، نسل، زبان اور وطنیت کی نفی کر کے توحید و رسالت کی بنا پر ایک روحانی الذہن قوم کی تشکیل کرتی ہیں۔ غرض یہ کہ علامہ اقبال کے نزدیک اسلام کا سیاسی نصب العین یہ ہے کہ دنیا کو وحدت الہ کی بنا پر وحدت آدم کا تصور دے کر ایک عالمگیر انسانی برادری قائم کی جائے تاکہ قوموں کے درمیان جنگ وجدل کے لامتناہی سلسلے کو ختم کر کے اس دنیا کو امن اور سکون کا گہوارہ بنایا جا سکے۔

اس نصب العین کی خاطر علامہ اقبال نے جب ہندوستان میں مسلمانوں کے حالات پر نظر دوڑائی تو ان کا تاثر یہ تھا کہ کردار کے اعتبار سے ہندی مسلمان دنیا کے دوسرے ملکوں میں بسنے والی مسلمان قوموں کے مقابلے میں پست ترین سطح پر ہیں اور ان کے اخلاقی زوال کا باعث سیاسی غلامی اور غیر اسلامی تصوف کے وہ اثرات ہیں جو ان کی بے عملی اور پست ہمتی کا باعث بنے ہیں، اس لئے مسلمانوں کو کردار کی اس پستی سے نکالنے کے لئے آپ نے خودی (فلسفہ حیات فردیہ) اور بیخودی (فلسفہ حیات اجتماعیہ) کی جو تعلیم دی وہ اگرچہ امت مسلمہ کی تمام قوموں کے لئے یکساں اہمیت رکھتی ہے لیکن ہندوستان کی ایک خصوصیت انہیں اپنے نصب العین کے حصول کے لئے بے حد سازگار دکھائی دی۔ اس کا اظہار آپ نے خطبہ الہ آباد میں یہ کہہ کر کیا کہ "دنیا بھر میں شاید ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں اسلام کی وحدت خیز قوت کا بہترین اظہار ہوا ہے۔" اس کی تفصیل یوں ہے کہ اگرچہ صدیوں سے ہندوستان نسل، زبان، مذہب اور علاقائی اعتبارات سے مختلف اقوام کا ایک ملک چلا آرہا ہے لیکن ان میں ملت اسلامیہ ہی ایک ایسی قوم ہے جس میں شامل ہوتے ہی رنگ، نسل، زبان اور علاقائیت کے امتیازات مٹنے لگتے ہیں اور اس میں شامل ہونے والے افراد اسلام کا رنگ غالب آنے کے ساتھ ہی ایک مستحکم اور پائیدار نظام اخوت کا حصہ بنتے جاتے ہیں،

چنانچہ اسلامی تہذیب کی یہی وہ خصوصیت ہے جو پوری دنیا کے انسانوں کو توحید کی روحانی اساس پر ایک عالمی برادری کی منزل تک لے جانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

علامہ اقبال کی فکری اور سیاسی جدوجہد کو جب ہم ان کے عالمی نصب العین سے جدا کر کے پاکستان کے حصول تک محدود کر دیتے ہیں تو اس کے نتیجے میں دو طرح کے فکری رویے سامنے آتے ہیں۔ سیکولر سوچ رکھنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ حصول پاکستان کے بعد علامہ اقبال کا مشن اپنے اختتام کو پہنچ چکا اور دینی سوچ رکھنے والے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کے بعد علامہ اقبال کا مشن مکمل ہو جائے گا۔ علامہ اقبال کے مطمح نظر کو سامنے رکھا جائے تو یہ دونوں سوچیں نامکمل اور غائت پاکستان کے بارے میں کم نگاہی کی دلیل ہیں۔ اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ علامہ اقبال کافر اور مومن کی پہچان میں بھی آفاقی نقطۂ نظر کی کسوٹی کو لازم قرار دیتے ہیں، "اسلام کی وحدت خیز قوت" میں یقین رکھتے ہیں اور "اسلام کا مقصود فقط ملت آدم" کو سیاسی نصب العین کے طور پر اپنائے ہوئے ہیں اور اسے "سم افرنگ" کا تریاق سمجھتے ہیں۔ اس لئے یہ ممکن نہیں کہ ان کے تصور پاکستان کو ایک خطہ ارضی کے حصول یا محض اسی میں اسلامی قانون کے نفاذ تک محدود رکھا جائے۔

علامہ اقبال کے مخصوص نقطہ نظر سے اگر غائت پاکستان کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ پاکستان درحقیقت دنیا میں ایک نئے عالمی نظام کے قیام کی نوید ہے، وحدت آدم کی طرف پیشرفت کی پہلی منزل ہے اور 'معمار جہاں باز بہ تعمیر جہاں خیز' کی پکار پر بیداری کی پہلی علامت ہے۔ چنانچہ یہی وہ ملک ہے جہاں سے پوری دنیا کو نظر آنا چاہیے کہ اسلام اپنے عالمی کردار سے غافل نہیں ہے اور دنیا میں نسل پرستی، لسانیت، علاقائیت، اور وطنیت کی تمام عصبیتوں کے خلاف جہاد کا اعلان ہے پاکستان کے قیام کی حقیقی غرض و غائت بس یہی ہے۔

اس مقالہ کا مقصد نئی نسل کو غائت پاکستان سے آگاہ کرنا ہے۔ اس کے پہلے حصے میں علامہ اقبال کی زندگی بھر کی جدوجہد کا جائزہ لیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں ان کے سیاسی نصب العین کو بیان کیا گیا ہے جو ان کے تصور پاکستان کے مطابق غائت پاکستان ہے دونوں حصے اپنی اپنی جگہ الگ الگ مکمل مضامین بھی ہیں۔

۱

علامہ اقبال: باطل کے خلاف اسلام کا قدرتی رد عمل

"دور حاضر میں باطل تصورات کے خلاف اسلام کا وہ قدرتی رد عمل جس کا آغاز اقبال کی ذات میں ہوا۔ جب تک کمال کو نہ پہنچے اور اپنے مقصد کو نہ پالے رک نہیں سکتا" ـــــ یہ الفاظ ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے ہیں جو ان کی کتاب "پاکستان کا مستقبل" میں درج ہیں۔(۱)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم و مغفور کے نزدیک علامہ اقبال کی ذات میں وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جو خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی امتی کو دور حاضر کے باطل تصورات کے خلاف اسلام کے قدرتی رد عمل کا آلہ کار بنانے کے لیے موزوں ہوسکتی ہیں۔ اس ضمن میں آپ نے حضرت علامہ کی ان تین صلاحیتوں کا ذکر بھی کیا ہے جن کی بنا پر آپ نے علامہ کے بارے میں یہ رائے قائم کی۔ آپ کے الفاظ میں ان صلاحیتوں کا خلاصہ یہ ہے:

اولاً یہ کہ علامہ اقبال مغرب کے باطل فلسفیانہ نظریات کے تاروپود سے بخوبی واقف تھے۔

ثانیاً یہ کہ انہیں دین کا علم حاصل تھا۔ علم دین کے بارے میں ڈاکٹر رفیع الدین کا نظریہ یہ ہے کہ یہ علم محض مطالعہ کتب پر موقوف نہیں بلکہ روحانی استعداد پر منحصر ہے۔

ثالثاً یہ کہ انہیں شاعری کا ملکہ عطا ہوا تھا جو الہامی کلام کے بعد سب سے زیادہ موثر طرز کلام ہے۔(۲)

ان صلاحیتوں کا بھرپور اظہار جس حسن و خوبی کے ساتھ علامہ اقبال نے کیا اس سے ان پر "پیمبری کرد و پیمبر نتواں گفت" کا گمان ہوتا ہے۔ اسی قسم کے تاثر کے تحت اینی میری شمل نے اپنی کتاب Gabriel's Wings کا خاتمہ ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے:

> Nobody will assert that he was a prophet —that would be wrong both from the viewpoint of history of religion and incompatible with the Islamic dogma of finality of

prophethood- but we may admit that he has been touched by Gabriels' wings." (3)

خود علامہ اقبال اپنا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں :

نغمہ من از جہان دیگر است
ایں جرس را کاروان دیگر است
ہیچ کس رازے کہ من گفتم نگفت
ہمچو فکر من در معنی نہ سفت
سر عیش جاوداں خواہی بیا
ہم زمیں ہم آسماں خواہی بیا
پیر گردوں بامن ایں اسرار گفت
از ندیماں رازہا نتواں نہفت

یہ اشعار ایک شاعر کی لے سے بہت بلند سطح پر ایک پیغمبرانہ پکار کی آہنگ میں ڈھلے ہوئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود علامہ اقبال کو بھی اپنی خداداد صلاحیتوں کا کس قدر گہرا احساس ہے۔ ایک شعر میں تنبیہہ کے لہجے میں فرماتے ہیں :

بے نیازانہ زشوریدہ نوائم مگذر
مرغ لاہوتم و از دوست پیامے دارم

بلاشبہ حضرت علامہ کو پختہ یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو قوم کی رہنمائی کے لیے خاص طور پر چن لیا ہے۔ انہیں اپنی صلاحیتوں سے بھی آگاہی تھی اور اس بات کا یقین تھا کہ یہ صلاحیتیں قوم کی رہنمائی کے لیے انہیں قدرت کی طرف سے خاص طور پر ودیعت کی گئی ہیں۔ اسی لیے وہ اپنی ان صلاحیتوں کو ایک ایک کر کے قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ مثلاً :

۱۔ آپ کا پہلا دعویٰ یہ ہے کہ علوم جدید اور دانش حاضر کی خوبیوں، خامیوں اور فتنہ سامانیوں سے آپ بخوبی آگہ ہیں اور ان کے محاسن و معائب میں تمیز کر سکتے ہیں :

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیلؑ

طلسم عصر حاضر را شکستم
ربودم دانہ و دامش گسستم
خدا داند کہ مانند براہیم
بہ نار او چہ بے پروا نشستم

۲۔ آپ کا دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ آپ کو علم دین کی دولت بخشی گئی ہے:

دولت جان حزیں بخشندہ
بہرۂ از علم دیں بخشندہ

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ نے علم دین روایتی طریقے سے (یعنی کسی دینی مدرسے میں تعلیم کے ذریعے) حاصل نہیں کیا تھا۔ اس لیے آپ کا علم دین نصابی اور کتابی نہیں تھا بلکہ "پیر گردوں بامن ایں اسرار گفت" اور "مرغ لاہوتم و از دوست پیامے دارم" کے دعووں کے مطابق روحانی استعداد پر مبنی تھا۔ فرماتے ہیں:

تھا ضبط بہت مشکل اس سیل معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرار کتاب آخر

قلندر جز دو حرف لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

انہوں نے اپنی روحانی استعداد کے لیے تصوف کی لغت سے قلندر کی اصطلاح منتخب کی ہے۔

۳۔ علامہ اقبال کا تیسرا دعویٰ یہ ہے کہ آپ نے شاعری کو محض ایک ذریعہ ابلاغ کے طور پر اپنایا ہے۔ انہیں شدید اصرار ہے کہ جو شخص انہیں محض شاعر کی حیثیت دیتا ہے وہ ان پر ظلم کرتا ہے، تہمت دھرتا ہے جس کے خلاف وہ نبی ﷺ کی بارگاہ اقدس میں شکایت گزار ہیں۔ وہ بار بار کہتے ہیں کہ ان کے اس پیغام پر توجہ دی جائے جس کے ابلاغ کے لیے انہوں نے اپنی شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا ہے۔

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست
بت پرستی، بت گری مقصود نیست

نغمہ کجا و من کجا، ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقہ بے زمام را

نہ بینی خیر ازاں مرد فرودست
کہ برمن تہمت شعر و سخن بست

من اے میر امم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزلخوانے شمردند

اپنے پیغام کے حوالے سے علامہ اقبال اپنی شاعری کو لازوال سمجھتے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ ان کے مرنے کے بعد بھی آنے والی نسلیں ان کے افکار و اشعار سے رہنمائی اور ولولہ حاصل کریں گی، ان کے اشعار نئی نسلوں کے لیے مینارہ نور ثابت ہوں گے جو ان کے قلوب کو گرمائیں گے اور ان سے خراج تحسین و عقیدت وصول کریں گے:

نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم
من نوائے شاعر فرداستم

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد
چشم خود بربست و چشم ماکشاد

پس از من شعر من خوانند و دریابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے

غرض علامہ اقبال کے اپنے دعوؤں میں بھی انہی تین خصوصیات کا بیان ہے جن کی بنا پر ڈاکٹر محمد رفیع الدین انہیں دور حاضر کے باطل نظریات کے خلاف اسلام کا قدرتی ردعمل قرار دیتے ہیں اور اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ یہ ردعمل جب تک

اپنے کمال و اتمام کو پہنچ کر اپنے مقصد کو نہ پالے، رک نہیں سکتا۔

علامہ اقبال کی ذات میں باطل کے خلاف اسلام کا قدرتی ردعمل کب، کیسے اور کس طرح ظاہر ہوتا ہے یہ ایک دلچسپ داستان ہے۔ علامہ اقبال کا ارادہ تھا کہ وہ اپنے قلب کی سرگزشت تحریر کر جائیں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ یہ سرگزشت ضبط تحریر میں آنے سے لوگوں کو بہت فائدہ ہوگا۔ مگر انہیں اس کام کے لیے فرصت میسر نہ آسکی۔ البتہ کہیں کہیں اس کی جستہ جستہ جھلکیاں دیکھنے کو مل جاتی ہیں، مثلاً:

۱۔ آپ نے اس بات کا برملا اعتراف کیا ہے کہ وہ ایک زمانے میں، سال ہا سال تک تشکیک میں مبتلا رہے۔

سالہا بودم گرفتار شکے
از دماغ خشک من لا ینفکے
حرفے از علم الیقین ناخواندۂ
در گماں آباد حکمت ماندۂ

۲۔ اسی طرح انہوں نے طالب علمی کے زمانے میں ہیگل، گوئٹے، غالب، مرزا بیدل اور ورڈز ورتھ سے متاثر ہونے کا اقرار کیا ہے بلکہ یہاں تک کہا ہے کہ ورڈز ورتھ کی شاعری نے انہیں دہریت سے بچا لیا۔(۴)

۳۔ اسی طرح یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ یورپ میں اپنے قیام کے دوران وہ ایسے حالات میں سے گزرے جنہوں نے انہیں مسلمان کر دیا، چنانچہ وحید احمد مدیر نقیب بدایوں کے نام اپنے ایک خط (مورخہ ۷ ستمبر ۱۹۲۱ء) میں لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا۔ یہ داستان طویل ہے۔ کبھی فرصت ہوئی تو اپنے قلب کی تمام سرگزشت قلمبند کروں گا جس سے مجھے یقین ہے بہت لوگوں کو فائدہ ہوگا۔"(۵)

پھر اسی خط میں ذرا پہلے آپ نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ جب وہ یورپ میں تھے تو انہیں پہلی بار یہ احساس ہوا کہ اسلام کے سب سے بڑے دشمن نسلی اور ملکی قومیت کے تصورات ہیں۔ خط کے الفاظ یہ ہیں:

"اس زمانے میں سب سے زیادہ دشمن اسلام اور اسلامیوں کا نسلی امتیاز اور ملکی قومیت کا خیال ہے۔ پندرہ برس ہوئے جب میں نے پہلے پہل اس کا احساس کیا۔ اس وقت میں یورپ میں تھا اور اس احساس نے میرے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔"(۶)

علامہ نے اس خط میں یہ اعتراف کیا ہے کہ ان کی اپنی زندگی پر اس کا حیرت انگیز اثر ہوا اور اس خیال کو دنیا میں پھیلانے کے لیے انہوں نے اپنے آپ کو وقف کر دیا:

"اس دن سے جب یہ احساس ہوا آج تک برابر اپنی تحریروں میں یہی خیال میرا مطمح نظر رہا ہے۔ معلوم نہیں میری تحریروں نے اور لوگوں پر اثر کیا یا نہیں لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اس خیال نے میری زندگی پر حیرت انگیز اثر کیا ہے۔"(۷)

۴۔ افکار و خیالات میں یہ انقلاب عظیم جس نے علامہ اقبال کی زندگی پر "حیرت انگیز اثر" کیا اور جسے آپ نے اپنی تمام تحریروں میں اپنا مطمح نظر بنائے رکھا، نسلی اور ملکی قومیت کے تباہ کن مضمرات کا احساس اور شعور تھا اور اس کے خلاف جہاد کرنے کا عزم آپ نے اپنے قیام یورپ (۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء) کے دوران ہی کر لیا تھا جس کا اولین سراغ ہمیں "بانگ درا" کی ایک غزل میں ملتا ہے، جس پر آپ نے خصوصی طور پر "مارچ ۱۹۰۷ء" کی تاریخ ثبت کی ہے۔ یہی وہ غزل ہے جس میں آپ نے پہلی بار ظلمت شب میں اپنے درماندہ کارواں کی رہنمائی کا عزم ظاہر کیا ہے۔ اس غزل میں اہل یورپ کے لیے وارننگ بھی ہے اور عالم اسلام کے لیے خوشخبری بھی۔ اسلامیان ہندوستان کے قافلہ مور ناتواں کے لیے پیام امید بھی ہے اور اپنے عزم جہاد کا اعلان بھی:

سنا دیا گوش منتظر کو حجاز کی خامشی نے۔ آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

دیار مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا
سفینہ برگ گل بنا لے گا قافلہ مور ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا
میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا

یہ غزل کہنے کے پچیس سال بعد ۱۹۳۱ء میں علامہ اقبال دوسری مرتبہ انگلستان تشریف لے گئے تو وہاں اپنے اعزاز میں منعقدہ ایک تقریب میں اسی غزل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"اہل یورپ کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے مذہب و حکومت کو علیحدہ علیحدہ کر دیا۔ اس طرح ان کی تہذیب روح اخلاق سے محروم ہوگئی اور اس کا رخ دہریانہ مادیت کی طرف پھر گیا' میں نے آج سے پچیس برس پیشتر اس تہذیب کی یہ خرابیاں دیکھی تھیں تو اس کے انجام کے متعلق پیش گوئیاں کی تھیں۔ میری زبان پر وہ پیش گوئیاں جاری ہوگئیں اگرچہ میں خود بھی ان کا مطلب نہ سمجھتا تھا۔ یہ ۱۹۰۷ء کی بات ہے۔ اس سے چھ سات سال بعد یعنی ۱۹۱۴ء میں میری یہ پیشگوئیاں حرف بہ حرف پوری ہوگئیں۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ یورپ دراصل اہل یورپ کی اس غلطی کا نتیجہ تھی جس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں یعنی مذہب و حکومت کی علیحدگی اور دہریانہ مادیت کا ظہور۔ بالشوزم مذہب و حکومت کی علیحدگی کا ایک طبعی نتیجہ ہے۔ میں نوجوانوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ مادیت سے بچیں۔" (۸)

مغربی تہذیب کی سب سے بڑی خرابی دہریانہ مادیت تھی جو حکومت سے مذہب کی علیحدگی کے باعث پیدا ہوئی اور اس کے نتیجے میں دوسری تمام خرابیاں پیدا ہوئیں جن کی بنا پر وطن پرستی اور نسل پرستی مغربی تہذیب کا امتیازی نشان بن گئی۔ پہلی جنگ

عظیم ۱۹۱۴ء سے شروع ہوئی اور ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی۔ اس میں ایک کروڑ فوجی قتل ہوئے' لاپتہ فوجیوں کی تعداد تیس لاکھ تھی جن کے بارے میں یہی خیال کیا گیا کہ وہ بھی دوران جنگ ہلاک ہوگئے ہوں گے۔ دو کروڑ فوجی زخمی تھے اور تیس لاکھ قید ہوئے۔ فوجیوں کے علاوہ عام شہری بھی ایک کروڑ تیس لاکھ کی تعداد میں موت کے گھاٹ اتر گئے' پچاس لاکھ عورتیں بیوہ ہوئیں اور نوے لاکھ بچے یتیم ہوگئے۔ تہذیبی خودکشی کا اس سے بڑا سانحہ اور کیا ہو سکتا ہے!

یورپ میں زمانہ طالب علمی گزار کر علامہ اقبال جولائی ۱۹۰۸ء میں جب وطن لوٹے تو یہاں پہنچتے ہی اپنے "درماندہ کارواں" کے متعلق سوچ بچار کرنے لگے جسے "ظلمت شب" سے نکالنے کا پختہ عزم آپ نے وطن واپس آنے سے پہلے ہی کر لیا تھا۔ اس درماندہ کارواں کے بارے میں آپ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھے بلکہ اس "قافلہ مور ناتواں" کے بارے میں آپ کی رائے ہرگز اچھی نہیں تھی۔ چنانچہ اپنی ایک بیاض میں مسلمانانِ ہند کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "Ever since their political fall the Musalmans of India have undergone a rapid ethical deterioration. Of all the Muslim communities of the world they are probably the meanest in the point of character." (9)

حیرت کی بات ہے کہ اسی قسم کے مسلمانوں کی مدد سے وہ ایک ایسا جہاں نو تعمیر کرنے کے منصوبے پر عمل پیرا ہونے کے لیے اٹھے جس کا مقصد یہ تھا کہ ساری دنیا میں امن قائم ہو جائے۔ اسی بیاض کے ایک صفحہ پر اس دنیا کی تعمیر نو کے امکان کے بارے میں اپنی پر امیدی اور وثوق کا اظہار کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "Given character and healthy imagination it is possible to reconstruct this world into a veritable paradise".(10)

یورپ سے واپسی کے بعد علامہ اقبال کو سب سے زیادہ دلچسپی اسلام کے اخلاقی اور سیاسی تصورات سے رہی اور اس سلسلے میں آپ کی اولیں تحریر "Islam as a Moral and Political Ideal" کے عنوان سے ایک مقالہ کی صورت میں "ہندوستان ریویو" کے شمارہ بابت جولائی دسمبر ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی جس میں آپ نے

پہلی بار اپنے اخلاقی اور سیاسی نظریات کو ایک واضح اور متعین صورت دینے کی کوشش کی ہے۔ اس مقالہ میں آپ نے اسلام کا سیاسی نصب العین یہ قرار دیا ہے کہ دنیا میں خوف اور غم سے پاک معاشرہ قائم ہو۔

انہی دنوں (یعنی ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء میں) آپ نے علی گڑھ یونیورسٹی کے سٹریچی ہال میں ایک لیکچر دیا جس کا موضوع تھا۔ "The Muslim Community : A Sociological Study" اس لیکچر میں آپ نے پہلی بار امت مسلمہ کے مخصوص اور منفرد تصور قومیت (Peculiar concept of nationality) کو اجاگر کرتے ہوئے مسلمانان ہند کو، جوان کے اولین مخاطب تھے، خبردار کیا کہ ان کی قومیت رنگ، نسل، زبان یا ملک کی اساس پر نہیں بلکہ عقیدہ پر انحصار رکھتی ہے لہٰذا وہ مغربی اقوام کی تقلید میں ملک، زبان یا نسل پر اپنی قومیت کو قیاس نہ کریں۔(۱۱) مسلمان ایک روحانی الذہن قوم ہیں جن کی قومیت عقیدہ توحید اور عقیدہ رسالت پر مبنی ہے، نیز ہمارا عقیدہ رسالت چونکہ ختم نبوت کے عقیدہ پر استوار ہے اس لیے بحیثیت قوم ہم زمانے میں خدا کا آخری پیغام بھی ہیں:

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

بے خبر تو جوہر آئینہ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

خدا کا آخری پیغام ہونے کی حیثیت سے دنیا میں ہمارا ایک نصب العین ہے جسے علامہ اقبال "حفظ و نشر توحید" کا نام دیتے ہیں۔ دنیا میں امن اور سلامتی قائم کرنے کا فریضہ ہمیں نے ادا کرنا ہے کیونکہ ہم اپنے عقیدہ توحید کی بنا پر ساری دنیا کے انسانوں کو خدا کا کنبہ سمجھتے ہیں، اس حوالے سے دنیا کے تمام انسانوں کو ایک ہی ملت، ملت

آدم شمار کرتے ہیں اور اس عالمگیر اخوت کی بنا پر انسانوں میں ملک' زبان' رنگ اور نسل کی بنیاد پر کسی قسم کی تفریق اور کسی قسم کا امتیاز روا نہیں رکھتے۔ اسلام کے معنی ہی امن اور سلامتی کے ہیں لہٰذا دنیا میں امن و سلامتی کے سب کے بڑے داعی ہم ہیں اور جب تک دنیا میں امن قائم نہیں ہوتا' ہماری قومی جدوجہد ختم نہیں ہو سکتی کیونکہ ہمارا نصب العین ایک الہ واحد کے عقیدے کی بنا پر دنیا کے تمام انسانوں پر مشتمل ایک ملت آدم قائم کرنا ہے جسے آپ نور توحید کا اتمام قرار دیتے ہیں:

وقت فرصت ہے کہاں' کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

یہ ہیں علامہ اقبال کی فکر کے وہ نمایاں پہلو اور اہم نکات جنہیں اگر ہم پوری طرح سے سمجھ لیں تو ان کی زندگی بھر کی جدوجہد کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے اور ان کا وہ مشن بھی سمجھ میں آ جاتا ہے جس میں پوری امت مسلمہ کو شریک کرنے کے لیے آپ نے شاعری کو ذریعہ ابلاغ بنایا' اور "ظلمت شب" میں اپنے "درماندہ کارواں" کو ساتھ لے کر عصر حاضر میں باطل قوتوں کے ساتھ ٹکرانے کا پختہ عزم کیا اور آپ کے اس عزم و استقلال میں عمر بھر کمی نہیں آئی۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین اگر اقبال کی ذات کو باطل نظریات کے خلاف اسلام کا قدرتی ردعمل قرار دیتے ہیں اور اس ایقان کا اعلان کرتے ہیں کہ جب تک یہ ردعمل اپنے اتمام کو پہنچ کر اپنے مقصد کو نہ پالے رک نہیں سکتا' تو اس کے محکم دلائل موجود ہیں۔

دور حاضر کے باطل نظریات کے خلاف علامہ اقبال کا جہاد مثنوی اسرار خودی کی اشاعت سے شروع ہوا جو علامہ اقبال کا سب سے پہلا مجموعہ کلام ہے۔ یہ مثنوی آپ نے ۱۹۱۰ء میں لکھنی شروع کی اور اکتوبر۔ نومبر ۱۹۱۴ء میں اسے پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ اپنی اس تصنیف کا پس منظر بیان کرتے ہوئے وہ خود فرماتے ہیں:

"۱۹۰۵ء میں جب انگلستان آیا تھا تو میں محسوس کر چکا تھا کہ مشرقی ادبیات اپنی ظاہری دلفریبیوں اور دل کشیوں کے باوجود اس روح سے خالی ہیں جو انسانوں کے لیے امید' ہمت' اور جرات عمل کا پیغام ہوتی ہے اور جسے زندگی

کے جوش یا ولولے سے تعبیر کرنا چاہیے- یہاں پہنچ کر یورپی ادبیات پر نظر ڈالی تو وہ اگرچہ ہمت افروز نظر آئیں لیکن ان کے مقابلے میں سائنس کھڑی تھی جو ان کو افسردہ بنا رہی تھی اور ۱۹۰۸ء میں انگلستان سے واپس گیا تو میرے نزدیک یورپی ادبیات کی حیثیت بھی تقریباً وہی تھی جو مشرقی ادبیات کی تھی-

ان حالات میں میرے دل میں کشمکش شروع ہوئی کہ ان ادبیات کے بارے میں رائے ظاہر کرنی چاہیے اور ان میں روح پیدا کرنے کے لیے کوئی نیا سرمایہ حیات فراہم کرنا چاہیے- میں اپنے وطن میں واپس گیا تو یہ کشمکش میرے دل میں جاری تھی اور میں اس میں اس درجہ منہمک تھا کہ دو تین سال تک میرے دوستوں کو بھی علم نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں-

۱۹۱۰ء میں میری اندرونی کشمکش کا ایک حد تک خاتمہ ہوا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے خیالات ظاہر کر دینے چاہیں لیکن اندیشہ تھا کہ ان سے غلط فہمیاں پیدا ہوں گی- بہرحال میں نے ۱۹۱۰ء میں اپنے خیالات کو مدنظر رکھ کر اپنی مثنوی اسرار خودی لکھنی شروع کی-

اردو کو چھوڑ کر فارسی میں شعر کہنا شروع کرنے کے متعلق اب تک مختلف لوگوں نے مختلف توجیہات پیش کی ہیں- مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج میں یہ راز بھی بتا دوں کہ میں نے کیوں اردو زبان کو چھوڑ کر فارسی میں شعر کہنے شروع کیے- بعض اصحاب خیال کرتے رہے ہیں کہ فارسی زبان میں نے اس لیے اختیار کی کہ میرے خیالات زیادہ وسیع حلقے میں پہنچ جائیں حالانکہ میرا مقصد اس کے بالکل برعکس تھا- میں نے اپنی مثنوی "اسرار خودی" ابتداء" صرف ہندوستان کے لیے لکھی اور ہندوستان میں فارسی سمجھنے والے لوگ بہت کم تھے- میری غرض تھی کہ جو خیالات میں باہر پہنچانا چاہتا ہوں وہ کم از کم حلقے تک پہنچیں- اس وقت مجھے یہ خیال بھی نہ تھا کہ یہ مثنوی ہندوستان کی سرحدوں سے باہر جائے گی' یا سمندر چیر کر یورپ پہنچ جائے گی' بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ اس کے بعد فارسی نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا

اور اسی زبان میں شعر کہتا رہا۔

میں نے جو خیالات ظاہر کیے ان پر ابتدا میں بہت سے اعتراض ہوئے حتیٰ کہ میری نسبت کہا گیا کہ میں دہریت کی تبلیغ کر رہا ہوں اور یہ اعتراض مسیحی کلیسا کے ایک رئیس کی طرف سے پیش ہوا۔" (۱۴)

علامہ اقبال نے اپنے دقیق خیالات اور نازک نکات پیش کرنے کے لیے عمداً یہ حکمت عملی اختیار کی کہ ابتدا میں یہ خیالات خواص کے کم سے کم حلقے تک پہنچیں اور ان کی وساطت سے عوام تک پہنچیں تاکہ عام لوگوں کو ان کے مفہوم اور مطالب کو صحیح صحیح سمجھنے میں آسانی رہے۔ اور اسی خیال کے پیش نظر آپ نے اردو شاعری کو چھوڑ کر فارسی شاعری کو اپنایا۔ آپ کا پہلا مجموعہ کلام مثنوی اسرار خودی کے نام سے ستمبر ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا، اور اس کا آغاز مولانا روم کے مندرجہ ذیل اشعار سے کیا گیا:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہان سست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزو ست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آں کہ یافت می نشود آنم آرزو ست

مثنوی اسرار خودی میں "حقائق حیات فردیہ" یعنی مطلوبہ سیرت و کردار کے انسان کے نقوش نمایاں کیے گئے ہیں۔ جس شیر خدا اور رستم دستانم کی آرزو علامہ اقبال کو تھی اس کا بیان اسرار خودی میں ان الفاظ میں ملتا ہے:

اے سوار اشہب دوراں بیا
اے فروغ دیدہ امکاں بیا
رونق ہنگامہ ایجاد شو
در سواد دیدہ ہا آباد شو
شورش اقوام را خاموش کن
نغمہ خود را بہشت گوش کن

خیز و قانون اخوت ساز دہ
جام صہبائے محبت ساز دہ
باز در عالم بیار ایام صلح
جنگجویاں رابدہ پیغام صلح
نوعِ انساں مزرع و تو حاصلی
کاروان زندگی را منزلی

حقیقتاً گویا علامہ اقبال کو ایسے انسان کی تلاش تھی جو شورش اقوام کو خاموش کر دے، دنیا میں امن و امان قائم کرے، ایسا جام محبت گردش میں لائے اور ایسا قانون اخوت دنیا کو دے جو کرہ ارض پر بسنے والی تمام اقوام کے لیے پیام صلح و آشتی ہو۔ علامہ اقبال کے پیغام کی منفرد اور امتیازی خصوصیت انسان دوستی کا یہی نصب العین (humanitarian ideal) ہے۔

اسرار خودی کی اشاعت کے فوراً بعد آپ نے ایک اور مجموعہ کلام مرتب کرنا شروع کر دیا جو ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں "اسرار حیات ملیہ" بیان کئے گئے ہیں اور اس میں اس جہان نو کا ذکر ہے جس کی تعمیر ان کے پیش نظر تھی۔ علامہ اقبال اپنے آپ کو اس نئے جہان کا پہلا آدم خیال کرتے ہیں:

دریں میخانہ اے ساقی ندارم محرمے دیگر
کہ من شاید نخستیں آدمم از عالمے دیگر

یہ نیا جہان جو نئے آدم کے ہاتھوں تعمیر ہونا ہے اسے وہ "مقصود رسالت محمدیہ" قرار دیتے ہیں، اس نئے جہان کی تفصیلات اس مثنوی میں موجود ہیں جسے آپ نے "رموز بےخودی" سے موسوم کیا۔ اس میں یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ رسالت محمدیہ کا مقصود "حریت و مساوات و اخوت بنی آدم" ہے اور اس نکتے کی توضیح و تشریح کے لیے ایک پورا باب مختص کیا ہے، اس میں فرماتے ہیں:

بود انساں در جہاں انساں پرست
ناکس و نابود مند و زیردست

از غلامی فطرت او دوں شدہ
نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ
تا امینے حق بحقداراں سپرد
بندگاں را مسند خاقاں سپرد
قوت او ہر کہن پیکر شکست
نوع انساں را حصار تازہ بست
تازہ جاں اندر تن آدم دمید
بندہ را باز از خداونداں رسید
نقش نو بر صفحہ ہستی کشید
امتے گیتی کشائے آفرید
امتے از ما سوا بیگانہ
بر چراغ مصطفیٰ پروانہ
امتے از گرمی حق سینہ تاب
ذرہ اش شمع حریم آفتاب
کائنات از کیف او رنگیں شدہ
کعبہ ہا بت خانہ ہائے چیں شدہ
مرسلان و انبیا آبائے او
اکرم او نزد حق اتقائے او
کل مومن اخوۃ اندر دلش
حریت سرمایہ آب و گلش
ناشکیب امتیازات آمدہ
در نہاد او مساوات آمدہ

دونوں مثنویوں کو ۱۹۲۳ء میں یکجا کر کے "مثنوی اسرار و رموز" کے نام سے شائع کیا گیا۔ اس کے آخر میں عرض حال بحضور رحمتہ اللعالمینؐ کے عنوان سے ایک طویل نظم شامل ہے جس میں نہایت پر زور الفاظ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس مثنوی میں

صرف قرآن حکیم کی ترجمانی کی گئی ہے۔ علامہ اقبال کو قرآن کی ترجمانی کے لیے اس مثنوی میں اپنے پیش کردہ خیالات پر اس حد تک اعتماد تھا کہ حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض گزار ہیں کہ اگر اس مثنوی میں قرآنی تعلیمات کے سوا ایک حرف بھی بیان کیا گیا ہو تو ان کے ناموس فکر کا پردہ چاک کیا جائے' قیامت کے دن انہیں خوار و رسوا کیا جائے اور اپنے پائے مبارک کے بوسہ سے محروم کر دیا جائے۔

گر دلم آئینہ بے جوہر است
در بحرفم غیر قرآن مضمر است
پردہ ناموس فکرم چاک کن
ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
روز محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسہ پا کن مرا

اپنے پیش کردہ پیغام پر اس درجہ اعتماد بجا لیکن اسلام کی جو تعبیر وہ عالمگیر انسانی اخوت کی صورت میں امت مسلمہ کے سامنے پیش کر رہے تھے شروع شروع میں اسے سمجھنے والا انہیں کہیں بھی نہیں مل رہا تھا۔ اپنے اس احساس تنہائی پر وہ سخت رنجیدہ اور دکھی تھے' غم و اندوہ کا جو طوفان ان کے دل و دماغ پر امڈ آیا تھا اس کا اظہار آپ نے ایک دعا میں کیا ہے جو اسرار خودی کے آخر میں شامل ہے۔

دل بدوش و دیدہ بر فرداستم
درمیان انجمن تنہا ستم
ہر کسے از ظن خود شد یار من
از درون من نجست اسرار من
در جہاں یا رب ندیم من کجاست
نخل سینائم کلیم من کجاست
سینہ عصر من از دل خالی است
می تپد مجنوں و محمل خالی است

شمع را تنہا تپیدن سہل نیست
آہ یک پروانۂ من اہل نیست
انتظارے غمگسارے تا کجا
جستجوئے رازدارے تا کجا
اے زروئت ماہ و انجم مستنیر
آتش خود را ز جانم باز گیر
ایں امانت باز گیر از سینہ ام
خار جوہر برکش از آئینہ ام
یا مرا یک ہمدم دیرینہ دہ
عشق عالم سوز را آئینہ دہ
خواہم از لطف تو یار ہمدمے
از رموز فطرت من محرمے
ہمدمے دیوانہ فرزانہ
از خیال ایں و آں بیگانہ

ایک طرف تو یہ کیفیت تھی کہ جو لوگ براہ راست ان کے مخاطب تھے وہ ان کے پیغام کو سمجھنے سے گریزاں یا قاصر تھے حالانکہ آپ نے اپنے پیغام کے ابلاغ کے لیے شروع میں صرف خواص کو چنا اور اسی لیے آپ نے اردو کو چھوڑ کر فارسی زبان کو اختیار کیا تھا مگر خواص میں بھی انہیں اپنا کوئی راز دار و غمگسار نہیں مل رہا تھا۔ دوسری طرف متعصب غیر مسلم نقاد آپ کی شاعری کو اس کے اسلامی تشخص کی بنا پر Cultural deadlock کی نمائندہ شاعری ہونے کا الزام دیتے تھے۔ ایک نقاد نے تو علامہ اقبال کی شاعری کے لیے "Most dangerous outburst of Pan-Islamic irrendentism" کے الفاظ بھی استعمال کئے۔ پروفیسر ڈکسن نے آپ کے فلسفہ کو آفاقی تسلیم کرنے کے باوجود اطلاقی اعتبار سے "Particular and exclusive" قرار دیا۔(۱۳)

علامہ اقبال کو اپنے خلاف پھیلائی گئی ان غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے بہت

جدوجہد کرنی پڑی۔ ایک طرف مسلمانوں کے اعتراضات کا جواب دینا پڑا جو حافظ شیرازی اور عجمی تصوف پر آپ کی تنقید کی وجہ سے ناراض تھے اور دوسری طرف انہیں غیر مسلموں کو یہ سمجھانے میں دقت پیش آ رہی تھی کہ انسان دوستی کا جو نصب العین (Humanitarian ideal) ان کی شاعری میں بیان ہوا ہے وہ کسی ایک ملک اور قوم تک محدود نہیں بلکہ اس کی نوعیت عالمگیر اور آفاقی ہے اور اگر انہوں نے مسلم معاشرے سے خطاب کیا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ ایک عملی انسان ہیں اور ان کا مقصد فلسفہ یا شاعری تک محدود نہیں بلکہ وہ اپنے نصب العین کو ٹھوس، حقیقی اور واقعاتی دنیا میں عملاً متشکل دیکھنا چاہتے ہیں جس کا آغاز لامحالہ کسی ایسی سوسائٹی سے ہی کیا جاسکتا تھا جس میں اس قسم کا نصب العین اپنانے کی پہلے سے صلاحیت موجود ہو اور جہاں سے اسے عملی شکل دے کر پوری دنیا تک وسعت دی جاسکے۔ چنانچہ ڈکنسن کے اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے پروفیسر نکلسن کے نام ایک خط میں اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا:

"The humanitarian ideal is always universal in poetry, but if you make it an effective ideal and work it out in actual life you must start not with poets but with a society exclusive in the sense of having a creed and well-defined outline but ever- enlarging its limits by example and persuasion. Such society according to my view is Islam. This society proved itself a more successful opponent of race idea which is the hardest barrier in the way of humanitarian ideal(14)

اسی خط میں آپ نے یہ بھی واضح کیا کہ چونکہ خود مسلمانوں کے اندر بھی نسل پرستی اور وطن پرستی کے جراثیم داخل ہو چکے ہیں اور اسلامی دنیا میں تیزی سے یہ وبا پھیل رہی ہے اس لیے وہ اپنا اولین فریضہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں دور حاضر کی ان گمراہیوں سے آگاہ کریں اور عالمگیر وحدت انسانی کا حقیقی نصب العین جو ان کی نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے انہیں یاد دلائیں۔ آپ لکھتے ہیں:

"Since I find that the idea of nationality on race or territory is making headway in the world of Islam

and since I fear that the Muslims, losing sight of their own ideal of universal humanity are being lured by the idea of territorial nationality I feel it my duty as a Muslim and lover of humanity to remind them of their true function in the evolution of mankind."(15)

نکلسن کے نام اسی خط میں آپ نے یہ بھی واضح کیا کہ دنیا کو خوف و غم سے نجات دلانے اور پرامن بنانے کے لیے بنی نوع انسان کو نسل، ذات پات، برادری، رنگ، زبان اور ملک کے تعصبات سے رہائی دلانے کا قابل عمل نظام چونکہ پہلے ہی سے اسلام کی صورت میں موجود ہے اس لیے اسے اپنی شاعری میں نظرانداز کرنا ان کے لیے ممکن نہیں بلکہ یہ تو ایسی چیز ہے جو اہل یورپ کو اسلام سے سیکھنی چاہیے :

"The object of my Persian poems is not to make out a case for Islam; my aim is simply to discover a universal social reconstruction and in this endeavour I find it philosplically impossible to ignore a system which exists with the express object of doing away with all distinctions of caste, rank and races and which while keeping a watchful eye on the affairs of the world fosters a spirit of otherworldliness so absolutely essential to man in his relations with his neighbours. This is what Europe lacks and this is what she still can learn from us.(16)

پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی تو مغربی تہذیب کی خودکشی کی پیش گوئی ایک حد تک پوری ہو چکی تھی اور علامہ اقبال کا جہاں یہ خیال تھا کہ اس تہذیب و تمدن کے خاکستر سے اب نیا آدم اور نیا جہان تعمیر ہوگا وہاں انہیں یہ بھی اندیشہ تھا کہ "جنگ عظیم کی کوفت کے بعد یورپ کے قوائے حیات کا اضمحلال چونکہ ایک صحیح اور پختہ نصب العین کے لیے ناساعد ہے اس لیے عوام کی طبائع پر کہیں وہ فرسودہ اور ست رگ اور زندگی کی دشواریوں سے گریز کرنے والی "عجمیت" غالب نہ آجائے جو جذبات قلب کو افکار دماغ سے متمیز نہیں کرسکتی۔"(۱۷) اسی قسم کی "عجمیت" نے پہلے بھی جرمنی میں قومی انحطاط کے زمانے میں گوئٹے کے دل و دماغ پر قبضہ کرلیا تھا اور اس

نے "زندگی کی حرارت" تلاش کرنے کے بجائے حافظ شیرازی کی نغمہ طرازیوں میں سکون اور امن تلاش کر لیا۔ اور ہندوستان میں امت مسلمہ کے دور انحطاط میں مسلمانوں نے بھی حافظ شیرازی کے کلام کے زیر اثر زندگی سے گریز کی راہیں تلاش کیں۔ اس لیے حافظ شیرازی کی نشہ آور شاعری سے بچنے کی تلقین آپ نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی کی اور اہل یورپ کو خبردار کرنے کی ضرورت کے تحت گوئٹے کے "دیوان مغرب" کے جواب میں آپ نے "پیام مشرق" کے نام سے ایک فارسی دیوان بھی مرتب کیا۔

پیام مشرق علامہ اقبال کا تیسرا مجموعہ کلام ہے جو ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا۔ اس کے دیباچہ میں آپ لکھتے ہیں:

> "یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کے خاکستر سے فطرت، زندگی کی گہرائیوں میں سے نیا آدم اور اس کے رہنے کے لیے نیا جہان تعمیر کر رہی ہے، جس کا ایک دھندلا سا خاکہ ہمیں حکیم آئن شائن اور برگسان کی تصانیف میں ملتا ہے۔ یورپ نے اپنے علمی، اخلاقی اور اقتصادی نصب العین کے خوفناک نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے ہیں۔(۱۸)

اسی دیباچہ کے آخر میں لکھتے ہیں:

> "اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو قابل احترام ہے۔"(۱۹)

پیام مشرق کے آخری حصے میں "نقش فرنگ" کے عنوان سے ایک طویل نظم شامل ہے جس میں اہل یورپ کو پر زور الفاظ میں دعوت دی گئی ہے کہ وقت آن پہنچا ہے کہ "آئین دگر" بروئے کار لایا جائے۔ اور "آئین دگر" سے ان کی مراد اسلام ہے۔

وقت آں است کہ آئین دگر تازہ کنیم
لوح دل پاک بشوئیم و ز سر تازہ کنیم

چنانچہ وہ پکار پکار کر ہر صاحب بصیرت سے کہتے ہیں کہ آنکھیں کھولو اور دیکھو کہ زندگی خود اس بات کی تمنائی ہے کہ جہان نو تعمیر ہو۔

چشم بکشائے اگر چشم تو صاحب نظر است
زندگی در پئے تعمیر جہان دگر است

علامہ اقبال کی یہ پکار ایک ایسے وقت میں بلند ہو رہی تھی جب پوری اسلامی دنیا سخت کسمپرسی کی حالت میں تھی اور فرنگی استعمار کی گرفت ہندوستان پر بہت مضبوط تھی۔ سنگینی حالات کے زیر اثر علامہ اقبال کے غم و اندوہ کی یہ کیفیت تھی کہ انما اشکو بثی وحزنی الی اللہ کے مصداق کبھی خدا سے شکوہ سنج ہوتے کہ "ہزار شب دہد تاب یک سحر نہ دہد" اور کبھی عالم بیتراری میں یہ فرماتے کہ "ہم از خدا گلہ دارم کہ برزبان نرسد" لیکن ان انتہائی مایوس کن حالات میں بھی قرآن کی رزمیہ پکار "کتب اللہ لاغلبن انا و رسلی ان اللہ قوی عزیز" اپنے گوش دل میں اتارتے اور یقین محکم کی چٹان پر مضبوطی سے قدم جمائے اہل فرنگ کو للکارتے رہے:

من دریں خاک کہن، گوہر جاں می بینم
چشم ہر ذرہ چوں انجم نگراں می بینم
دانہ آں را کہ باغوش زمیں است ہنوز
شاخ در شاخ برومند جواں می بینم
کوہ را مثل پر کاہے سبک می یابم
پر کاہے صفت کوہ گراں می بینم
انقلابے کہ نگنجد بہ ضمیر افلاک
بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم
خرم آں کس کہ دریں گرد سوارے بیند
جوہر نغمہ زلرزیدن تارے بیند

پیام مشرق ہی کے سال اشاعت (۱۹۲۳ء) میں آپ نے چودھری محمد حسین کے نام ایک خط میں اپنی ایک روحانی واردات کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا:

"There is lot of enthusiasm on heaven in respect of the

victory of Muslims but those on earth are silent. May God have pity on them. Our religious scholars have turned Islam into an ancient Asian creed..... I am sorry the Muslims have never recogised the modernity of Quran. They instead have interpreted its subject and truths in the light of ancient people and have thus mutilated its real sense and intent. I pray to God Almighty that He for the sake of His beloved Prophet (PBUH) produce such an interpreter among Muslims who gets at the "lost wisdom" once more and offers it to Ummah. Our demise is not near at hand. The Quran still holds."(20)

ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ علامہ اقبال کو بڑا دکھ تھا کہ مسلمان اپنے عالمگیر نصب العین کو دنیا میں با آواز بلند پھیلانے کے بجائے بالکل خاموش بیٹھے ہیں۔ مگر ان کے دل میں بہت پہلے (یعنی ۱۹۰۴ء) سے ہی یہ احساس جاگزیں تھا کہ دور حاضر کے نئے تقاضوں کے مطابق اسلام کو ایک جدید علم کلام اور جدید فقہ کی ضرورت ہے۔ اس کا ذکر بھی آپ نے اپنے ایک مضمون میں کیا جو "قومی زندگی" کے عنوان سے مجلّہ مخزن شمارہ اکتوبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا۔ اس میں لکھتے ہیں:

"اگر موجودہ حالات زندگی پر غور و فکر کیا جائے تو جس طرح اس وقت ہمیں تائید اصول مذہب کے لیے جدید علم کلام کی ضرورت ہے' اسی طرح قانون اسلامی کی جدید تفسیر کے لیے ایک بہت بڑے فقیہہ کی ضرورت ہے جس کے قوائے عقلیہ اور متخیلہ کا پیمانہ اس قدر وسیع ہو کہ وہ مسلمات کی بنا پر قانون اسلامی کو نہ صرف جدید پیرائے میں مرتب کر سکے بلکہ تخیل کے زور پر اصول کو ایسی وسعت دے سکے جو حال کے تمدنی تقاضوں کی تمام ممکن صورتوں پر حاوی ہو —— یہ کام ایک سے زیادہ دماغوں کا ہے اور اس کی تکمیل کے لیے کم از کم ایک صدی کی ضرورت ہے۔"(۲۱)

لیکن جب بیس سال تک اس سلسلے میں کسی طرف سے کوئی کوشش ہوتی دکھائی نہ دی تو آپ نے دسمبر ۱۹۲۴ء میں اجتہاد کے موضوع پر ایک مقالہ حبیبیہ ہال اسلامیہ کالج لاہور میں سر عبدالقادر کی صدارت میں پڑھا جس کی نقول ہندوستان کے بعض

نامور علماء کو بھیجی گئیں کہ وہ اس پر اپنی رائے دیں۔ اسی زمانے (۱۹۲۵ء) میں آپ نے بعض دوستوں کے نام اپنے خطوط میں یہ عندیہ ظاہر کیا کہ ان کے پیش نظر ایک منصوبہ "An Introduction to the Study of Islam" یا "Islam As I Understand it." کے عنوان سے انگریزی میں ایک کتاب تحریر کرنے کا ہے جس میں وہ حقائق اسلام کو جدید مغربی فلسفہ کی زبان میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔(۲۲) یہ منصوبہ کسی وجہ سے معرض التوا میں رہا البتہ چار پانچ سال کے دوران آپ نے جدید مغربی فلسفہ کی روشنی میں اسلام کی تشریح کے لیے وہ لیکچر تیار کر لیے جو "Six Lectures" کے نام سے ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئے اور ان کی اشاعت سے اسلامی فلسفہ اور جدید مغربی فلسفہ کو ایک دوسرے کا موقف سمجھنے کی راہ ہموار ہوئی۔ بعد کے ایڈیشن میں علامہ اقبال نے Is Religion Possible? کے عنوان سے ایک اور لیکچر کا اضافہ کیا اور نئے ایڈیشن کی اشاعت میں کتاب کا نام : Reconstruction of Religious Thought in Islam رکھا گیا۔ اسلام کو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق سمجھنے کے سلسلے میں آج بھی اس کتاب کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہ لیکچرز مغرب و مشرق کے مابین ایک تہذیبی مکالمہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان لیکچرز کے ذریعے اہل مغرب کے لیے اسلام کو سمجھنے میں بہت آسانی پیدا ہوئی۔ روایت ہے کہ جب یہ لیکچرز پہلی بار علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھے گئے تو چند طالب علموں نے بعد میں یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر پروفیسر ریمز بوتھم سے جو خود بھی کئی کتابوں کے مصنف تھے پوچھا: "سر! آپ تین لیکچروں میں تو موجود رہے لیکن اس کے بعد نظر نہیں آئے" تو انہوں نے کہا:

> "Dr. Iqbal dealt with the Philosophy of Islam so nicely that I was at the stake of leaving Christianity."(23)

اسی طرح اینی میری شمل لکھتی ہیں کہ جرمنی کے چوٹی کے فلسفی Rudolph Pannwit کو جب علامہ اقبال کے لیکچرز پڑھنے کے لیے دیے گئے تو اس نے ان کا مطالعہ کرنے کے بعد علامہ اقبال کو زبردست خراج تحسین پیش کیا' بہت داد دی اور بڑے رنج اور افسوس سے کہا: "کاش ڈاکٹر اقبال کی زندگی میں ان سے ملاقات ہو جاتی تو تبادلہ خیالات سے مجھے بے پناہ فائدہ ہوتا۔"(۲۴) اسی طرح علامہ اقبال نے اپنی شاعری

میں نئے آدم (قوی اور صحیح) کا جو تصور پیش کیا ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فان گرون بام (Von Grunebaum) کہتا ہے کہ اس تصور کے ذریعے علامہ اقبال نے امت مسلمہ کو دور حاضر میں عالمی تہذیبی ترقی میں حصہ دار بنا دیا ہے۔(۲۵) ڈاکٹر نکلسن نے بھی اعتراف کیا ہے کہ علامہ اقبال فلسفے کے دقیق حقائق کو نہایت دلکشا اور دلفریب اشعار میں پیش کرتے ہیں اور ایک خاص پیغام پہنچا رہے ہیں جس میں روحانیت کا پہلو غالب ہے۔(۲۶) اسی طرح ہربرٹ ریڈ نے کہا کہ مابعد الطبیعی صداقتوں کے معیار پر اگر عصر حاضر کے شعرا کی پرکھ کی جائے تو ایک ہی زندہ شاعر نظر آتا ہے اور وہ اقبال ہے۔

غرض بے شمار شواہد کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ مغرب میں اسلامی نظریات کو مغربی فلسفہ کی زبان میں متعارف کرانے میں علامہ اقبال کے ان لیکچرز کا بہت بڑا حصہ ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس کام کی ابتدا علامہ اقبال ہی سے ہوئی البتہ ان لیکچرز کے ذریعے آپ نے جو علمی روایت چھوڑی اسے بعد میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین' ڈاکٹر علی شر۔حتی' ڈاکٹر اسمٰعیل راجی الفاروقی اور عالیجا عزت بیگووچ نے آگے بڑھایا۔ یہ سبھی سکالر اسلام کو ایک عالمی مذہب' ایک عالمی فکر اور ایک عالمی معاشی و سیاسی نظام کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور علامہ اقبال کو اپنا پیشوا مانتے ہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین اور ڈاکٹر علی شر۔حتی تو افکار اقبال سے خوشہ چینی کا کھلا کھلا اعتراف کرتے ہیں' ڈاکٹر فاروقی علامہ اقبال کی عظمت کے قائل ہیں اور عالیجا عزت بیگووچ نے اپنی کتاب "Islam Between East & West" کا آغاز ہی علامہ اقبال کے درج ذیل اشعار سے کیا ہے جن میں اسلام کی آفاقیت اور عالمگیریت کا پرزور الفاظ میں اعلان کیا گیا ہے:

گرچہ از مشرق بر آید آفتاب
با تجلی ہائے شوخ و بے حجاب
در تب و تاب است از سوز دروں
تا ز قید شرق و غرب آید بروں
بر دمد از مشرق و خود جلوہ مست
تا ہمہ آفاق را آرد بدست

فطرتش از مشرق و مغرب بری است
گرچہ او از روئے نسبت خاوری است

پیام مشرق کے بعد آپ کے اردو اور فارسی کلام پر مشتمل سات کتابیں یکے بعد دیگرے شائع ہوئیں۔ اردو میں بانگ درا (۱۹۲۴)، بال جبریل (۱۹۳۵ء)، ضرب کلیم (۱۹۳۶) اور فارسی میں زبور عجم (۱۹۲۷)، جاوید نامہ (۱۹۳۲ء، مسافر، پس چہ باید کرد (۱۹۳۶ء) ان کی زندگی میں ہی منظر عام پر آ گئیں جبکہ ارمغان حجاز آپ کی وفات کے بعد شائع ہوئی جس کا نصف حصہ فارسی کلام اور نصف حصہ اردو کلام پر مشتمل ہے۔

ان تمام کتابوں میں اسلام کے عالمی کردار کو نمایاں کیا گیا ہے اور مسلمانوں کے لیے اسلام کے عالمی نصب العین کی وضاحت کی گئی ہے۔ دوسری طرف اہل مغرب کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ اسلام کے موقف کو سمجھنے کی کوشش کریں کیوں کہ صرف اسلام کے پاس ہی وہ روحانی اصول (یعنی توحید) موجود ہے جس کی بنا پر دنیا میں ایک عالمی انسانی برادری کا قیام ممکن ہے اور اس دنیا کو خوف اور غم سے نجات دلا کر امن و سلامتی کا گہوارہ بنایا جاسکتا ہے۔

اپنی عمر کے آخری حصے میں علامہ اقبال کو یہ اطمینان حاصل تھا کہ ان کا پیغام ان لوگوں تک پہنچ چکا ہے جن تک یہ پیغام پہنچانا مقصود تھا۔ اسرار خودی کی اشاعت پر اگر انہیں یہ دکھ ستا رہا تھا کہ "درمیان انجمن تنہا ستم" تو بال جبریل میں اطمینان کا اظہار ہے:

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں

بلکہ بال جبریل کی اشاعت سے بھی پہلے ۱۹۳۱ء میں والڈ روف ہوٹل (لندن) میں ایک استقبالیہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"اگرچہ میرا پیغام عمل تمام دنیا کے لیے ہے اور اہل ایران میرے دائرہ سامعین سے خارج نہیں مگر میرے کلام کے اول مخاطب ہندوستان ہی کے خواص تھے کیونکہ میں چاہتا تھا کہ میرا پیغام اول مرحلے میں خواص کا طبقہ سنے اور اپنی ذہنی استعداد کی بنا پر اسے صحیح طور پر سمجھے اور اسی طرح اخذ

کرنے کے بعد عوام تک پہنچائے۔

دنیا کی تاریخ میں اکثریوں بھی ہوا ہے کہ دقیق خیالات اور باریک نکات جب بغیر کسی واسطے کے ظاہر کیے گئے تو کسی نے ان کو سمجھا اور کسی نے نہ سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ متکلم کی بات اور اس کا مفہوم و مطلب کچھ کا کچھ ہوگیا۔ مجھے اس بات سے مسرت ہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے میرے اپنے ہمعصروں اور میرے مخاطبین نے میرے کلام کی روح تک پہنچنے میں ایسی ٹھوکر نہیں کھائی کہ گوہر مقصود گم ہو جائے۔"(۲۷)

ایک بامقصد مصنف اور شاعر کے لیے اس سے زیادہ وجہ تسکین اور کیا بات ہوسکتی ہے کہ اسے یہ اطمینان ہو جائے کہ اس کی بات صحیح طور پر سمجھی جا رہی ہے اور وہ اپنا پیغام پہنچانے میں کامیاب رہا ہے۔ اس سے بھی اہم تر بات یہ ہے کہ علامہ اقبال کے پیغام کے اثرات فوری طور پر ظاہر ہونے شروع ہوگئے اور مسلمانان ہند جن کو سیرت و کردار کے اعتبار سے خود علامہ اقبال پست سمجھتے تھے، خواب غفلت سے بیدار ہوئے اور ان میں اسلامی قومیت کا شعور ترقی کرنے لگا۔ روز گار فقیر میں فقیر سید وحید الدین نے گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک طالب علم چودھری نبی احمد کا یہ بیان ریکارڈ کیا ہے:

"یہ علامہ اقبال ہی تھے جنہوں نے مسلمان طلباء میں اسلامی قومیت اور اپنی مذہبی عظمت کا شعور پیدا کیا—— علامہ اقبال ہی کی بدولت مسلم طلباء میں اخلاقی جرات پیدا ہوئی کہ وہ معذرت آمیز انداز کی بجائے کھل کر پوری جرات کے ساتھ اسلام کی جامعیت اور اپنے نبیؐ کی عظمت بیان کرنے لگے—— اقبال کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے جسے ہم اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک فراموش نہیں کرسکتے۔ اقبال نے ہم میں روباہی کی جگہ اسد اللٰہی پیدا کی۔"(۲۸)

اسی طرح ۶ نومبر ۱۹۳۱ء کو لندن میں اقبال لٹریری ایسوسی ایشن کی طرف سے حضرت علامہ کو جو سپاس نامہ پیش کیا گیا اس میں کہا گیا تھا کہ:

"آپ نے ہمیشہ ایسے انسانوں کے فقدان پر اظہار تاسف کیا ہے جو آپ کے بلند تخیلات کے معنی سمجھ سکیں لیکن ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ

جن اسرار کا آپ نے انکشاف کیا ہے ان سے اب آہستہ آہستہ لوگ آشنا ہونے لگے ہیں۔ آپ نے اپنے اشعار میں جن بلند نظریات کو پیش کیا ہے اور اپنی نثر میں ایک فلسفی کی حیثیت سے جن افکار کو بیان فرمایا ہے وہ اپنا اثر کر رہے ہیں اور ان تخیلات کی آخری ظفرمندی میں اب کوئی شبہ نہیں رہا۔ ہمارا فرض اور حق ہے کہ ہم ان تخیلات کی تفسیر میں اپنی قوم کی اور دنیا کی دوسری اقوام کی امداد کریں۔"(۲۹)

علامہ اقبال کے پندرہ ہزار اشعار میں سے نو ہزار اشعار فارسی میں ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں اردو کو چھوڑ کر فارسی کا سہارا اس لیے لیا تھا کہ وہ شروع میں اپنے مخاطبین کا دائرہ بہت محدود رکھنا چاہتے تھے لیکن قدرت نے شاید آپ کو فارسی میں شعر گوئی کی طرف اس لیے راغب کیا تھا کہ وسط ایشیا کی فارسی بولنے والی اقوام میں آپ کا پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے اور حقیقت یہ ہے کہ ایران، افغانستان اور دوسری وسط ایشیائی ریاستوں کے مخصوص سیاسی حالات میں اقبال کی شاعری اور پیغام کی اشاعت میں دیر تو لگی لیکن ان کی وفات کے نصف صدی بعد ان کے پیغام کے لیے بے حد سازگار حالات پیدا ہو رہے ہیں اور ہر سطح پر ان کی فارسی شاعری مقبول ہو رہی ہے۔ علامہ اقبال کا کلام ہر جگہ اپنا اثر دکھا رہا ہے۔ سابق صدر اسلامی جمہوریہ ایران سید علی خامنہ ای اپنی ایک تقریر میں کہتے ہیں:

"اقبال کی وفات ۱۳۱۸ ہجری شمسی مطابق ۱۹۳۸ء میں ہوئی اور میرے خیال میں اس وقت سے اب تک یعنی اقبال کی وفات کے بعد سے آج تک کا جو طویل عرصہ ہے، اس میں اگرچہ اقبال کے نام سے سیمینار ہوئے، کتابیں لکھی گئیں اور تقریریں ہوئیں لیکن سب بیگانہ وار اور دور سے تھیں اور ہماری قوم اقبال کی حقیقت، اقبال کی روح اور اقبال کے عشق سے بے خبر رہی ہے اور اس عیب کی انشاء اللہ تلافی ہونی چاہیے، مثلاً شعرا، مقررین، مصنفین، جرائد اور متعلقہ سرکاری ادارے، وزارتیں مثلاً ثقافت و اعلیٰ تعلیم، وزارت تعلیم و تربیت اور وزارت ارشاد اسلامی ہر ایک انشاء اللہ اپنی اپنی باری سے کوشش کریں کہ اقبال کو اس طرح جیساکہ وہ ہیں زندہ

کریں اور ان کے کلام کو نصاب کی کتابوں میں شامل کریں۔"(۳۰)

عوامی سطح پر علامہ اقبال کے کلام کی پذیرائی کا ذکر کرتے ہوئے اینی میری شمل نے ایک بہت ہی دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ انہوں نے جب جاوید نامہ کا ترکی زبان میں ترجمہ کر کے شائع کیا تو اس کی اشاعت کے تھوڑے ہی دنوں بعد انہیں ایک خط وصول ہوا۔ خط کے انداز تحریر سے لگتا تھا کہ لکھنے والا نہایت ہی معمولی قابلیت کا آدمی ہے۔ خط پر دیا گیا پتہ پڑھا تو معلوم ہوا کہ مکتوب نگار مشرقی اناطولیہ کے کسی دور دراز شہر کے ایک ریسٹوران میں بیرا (Karon) ہے۔ اس نے خط میں لکھا تھا کہ میں ترکی زبان میں جاوید نامہ کا ترجمہ پڑھ کر بیحد محظوظ ہوا ہوں اور اگر اس شاعر کی دوسری کتابوں کے بھی تراجم دستیاب ہوں تو مجھے مہیا کئے جائیں۔(۳۱)

شعر اقبال کی آفاقی اپیل کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ ہزاروں میل دور واقع قصبہ کا ایک معمولی پڑھا لکھا غیر ملکی بھی علامہ اقبال کی کتاب کا اپنی زبان میں ترجمہ پڑھ کر جھوم اٹھتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ گویا کہ اس کے ساز حیات کے تاروں کو چھیڑ دیا گیا ہو۔

جہاں تک ان کی شاعری کے عملی اثرات کا تعلق ہے' اس سلسلے میں سید علی خامنہ ای کے مندرجہ ذیل الفاظ خاص طور پر قابل توجہ ہیں:

> "خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ملک اور ہمارے عوام میں خودی اور اسلامی شخصیت کا احساس کمال کی حد تک موجود ہے اور ہماری نہ شرقی نہ غربی (لاشرقیہ ولا غربیہ) کی پالیسی بالکل وہی چیز ہے جس کی بات اقبال کرتے ہیں۔"(۳۲)

علامہ اقبال کے پیغام کے یہ مثبت اثرات ہیں جو بے حد حوصلہ افزا ہیں اور ان کی وجہ سے اسلامی دنیا میں ہر کہیں بیداری اور حرکت کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ لیکن علامہ اقبال نے اسلام کو Humanitarian ideal کے حوالے سے جس طرح دیکھا اور سمجھا اسے مغربی دنیا کے سامنے پیش کرنے میں ہم ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکے۔ یعنی ابھی تک ہم دنیا کو یہ باور نہیں کرا سکے کہ اس کرہ ارض کو امن و سلامتی اور صلح و آشتی کا مسکن بنانا اسلام کا سیاسی نصب العین ہے۔

علامہ اقبال کا خیال تھا کہ ہندوستان میں اسلام کی وحدت خیز قوت کے کامیاب تجربے کا ایک ایسا عملی نمونہ موجود ہے کہ اسے اسلام کی عالمگیر تہذیبی تحریک کا نقطہ آغاز بنایا جا سکتا ہے بشرطیکہ اسے ان خطرات سے محفوظ رکھا جا سکے جو عصر حاضر میں جدید سیاسی نظریات کی مقبولیت کی وجہ سے اسلامی تہذیب کو لاحق ہیں۔ ان باطل نظریات میں ان کے نزدیک سب سے بڑا فتنہ نظریہ وطنیت اور دوسرا بڑا فتنہ لادینی جمہوریت ہے جو نہ صرف مسلمانوں کے تہذیبی وجود کے لئے سم قاتل بلکہ انسانی برادری کی تشکیل کی راہ میں بھی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ اس سیاسی پس منظر میں علامہ اقبال نے ہندی مسلمانوں کو بروقت مشورہ دیا کہ وہ اپنی تہذیبی قوت کو ہندوستان کے ایک حصے میں مجتمع کر لیں۔ اور برطانوی حکمرانوں پر واضح کیا کہ ہندوستان کے مسلمان جغرافیائی قومیت کے سیاسی فلسفے میں یقین نہیں رکھتے اس لئے یہ قرین انصاف نہیں ہو گا کہ ہندوستان میں دو متفرق قوموں کا وجود تسلیم کئے بغیر مغربی اصول جمہوریت پر عمل کیا جائے۔

درحقیقت ہندی مسلمانوں کی تہذیبی بقا کے لیے علامہ اقبال نے وہی کارنامہ انجام دیا جو مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ نے اپنے اپنے وقت میں دیا تھا لیکن عصر حاضر کی سیاست میں وطنیت اور لادینیت کی نفی کا جو کارنامہ علامہ اقبال نے دیا اس کی نوعیت بہت مختلف ہے۔ پاکستان کا قیام بلا شبہ آپ کے فکری جہاد کا مرہون منت اور نظریہ وطنیت کی شکست کا زندہ ثبوت ہے لیکن وطنیت اور لادینیت کے جن باطل نظریات کی نفی پر پاکستان قائم ہوا ان کا آج بھی چار سو عالم میں غلغلہ اور غلبہ ہے چنانچہ ایک بین الاقوامی معاند نظریاتی ماحول میں پاکستان ہمیشہ بے شمار مشکلات سے دوچار رہا اور بعض اوقات اس کا وجود تک معرض خطر میں پڑ گیا لیکن یہی خطرات "اگر خواہی حیات اندر خطر زی" کے مصداق پاکستان کے لیے سامان حیات بھی ہیں بشرطیکہ وطنیت اور لادینیت کے خلاف علامہ اقبال کے شروع کردہ جہاد کو پاکستان اپنا عالمی کردار اور توحید کے روحانی اصول کی بنیاد پر ملت آدم کے قیام کو اپنا عالمگیر مشن قرار دے اور دنیا میں ہر سو پھیلی ہوئی تاریکیوں کو دور کرنے کے لیے "خورشید کا سامان سفر تازہ" کرے۔

علامہ اقبال کا سیاسی نصب العین: حصول پاکستان یا تعمیر جہان نو؟

پاکستان میں علامہ اقبال کے پیغام کو سمجھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ انہیں "مصور جہان نو" کے بجائے محض "مصور پاکستان" کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ ہمالیہ جیسی بڑی یہ غلط فہمی اس لیے پیدا ہوئی کہ وطنی قومیت کے خلاف ان کی جدوجہد کو عالمی تناظر میں دیکھنے کے بجائے محض ہندوستان کے مقامی سیاسی تناظر میں "دو قومی کشمکش" کی شکل میں دیکھا گیا اور یہ سمجھ لیا گیا کہ حصول پاکستان کی شکل میں علامہ اقبال کا مشن پورا ہوگیا ہے۔ اس انداز فکر کی وجہ سے علامہ اقبال کے ساتھ جو ظلم ہوا سو ہوا مملکت پاکستان کے لیے بھی اس غلط فہمی کے نتائج مہلک اور تباہ کن ثابت ہو رہے ہیں اور پاکستان کی نئی نسل کو قیام پاکستان کا مقصد سمجھنے میں دشواری پیش آ رہی ہے۔

آج پاکستان کے بعض دانشور اور علما یہ مغالطہ آمیز تاثر پیدا کرنے میں مصروف ہیں کہ دو قومی نظریہ ایک مقامی ضرورت کے تحت' ایک وقتی تدبیر کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔ گویا ہندوستان کے مخصوص سیاسی حالات میں ہندو قوم کی عددی اکثریت' مذہبی تعصب' معاشی برتری اور سیاسی بالادستی سے نجات حاصل کرنے کے لیے دو قومی نظریہ ایک ایسا ہتھیار تھا جس کی حصول پاکستان کے بعد ضرورت باقی نہیں رہی' چنانچہ اب یہاں پاکستانی قومیت پیدا کرنے کی ضرورت ہے جس کا اعلان خود بانی پاکستان قائداعظم نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو یہ کہہ کر کر دیا تھا کہ "پاکستان میں ہندو ہندو نہیں رہے گا اور نہ مسلمان مسلمان" لہٰذا اب یہاں وطنی قومیت کو فروغ ملنا چاہیے۔ فرزند اقبال' جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ اگر پاکستان علامہ اقبال کی زندگی میں ہی قائم ہو جاتا تو وہ پاکستانی قومیت (Pakistani nationalism) کے نام سے ایک اصطلاح ایجاد کر دیتے:

"If Iqbal had lived to see the establishment of Pakistan, the realisation in concrete form of his abstract and nebulous political ideal, he would have developed yet another phrase and laid the foundations

of what may be termed as "Pakistani nationalism" (۶۶)

اس قسم کی باتیں علامہ اقبال کے سیاسی و ملی مشن سے بے خبری کی دلیل ہیں۔ علامہ اقبال کے نزدیک خطہ پاکستان "آغاز سفر" تھا "منزل مراد" نہیں تھی۔ یہ خطہ زمین ان کے نزدیک اسلام کی عالمی تمدنی تحریک کا پہلا پڑاؤ یا نقطہ آغاز (Base) تھا جس کی منزل مراد "شورش اقوام را خاموش کن" اور "باز در عالم بیار ایام صلح" تھی۔ یوں لگتا ہے کہ علامہ اقبال خود بھی اس اندیشے میں مبتلا تھے اور انہیں ڈر تھا کہ ہندوستان کے مسلمان کہیں اپنے سفر کے اس پہلے پڑاؤ کو ہی اپنی آخری منزل نہ سمجھ بیٹھیں اور اس سیاسی نصب العین سے ہی غافل نہ ہو جائیں جو ان کا مطمح نظر تھا۔ اسی اندیشے کے پیش نظر آپ نے قائداعظم کے نام اپنے ایک خط ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء میں تاکید کی :

"It is absolutely necessary to tell the world both inside and outside India that economic problem is not the only problem in the country. From the Muslim point of view the cultural problem is of much greater importance to most Indian Muslims.(۶۴)

اپنی بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے آپ نے اپنے اس خط میں یہ بھی لکھا کہ اسلام کے مستقبل کے حوالے سے ہمیں اپنی توجہ کا مرکز مسلم ایشیا کو بنانا چاہیے جس کے لیے ہندی مسلمانوں کی تنظیم اس عظیم کام کا اولین مرحلہ ہے' چنانچہ لکھتے ہیں :

"I believe you are aware that the new constitution has at least brought a unique opportunity to Indian Muslims for self organisation in view of the future developments both in India and Muslim Asia. While we are ready to cooperate with Progressive Parties we must not ignore that the whole future of Islam as a moral and political force in Asia rests very highly on complete organisation of Indain Muslims.(۶۵)

پاکستان کے یہ مقاصد قائداعظم پر بھی بخوبی واضح تھے' وحید الزماں لکھتے ہیں :

"Explaining the creed of Pakistan to Sardar Shaukat Hyat Khan early in 1943 he said that Pakistan would be able to train and bring up Muslim intellectuals, educationists,

economists, scientists, doctors, engineers, technicians etc who will work to bring about Islamic renaissance. After necessary training they would spread to other parts of the Islamic world to serve their co-religionists and create awakening in them, eventually resulting in the creation of a solid and cohesive block - a third block- which will neither be Communist nor Capitalist but truely socialistic based on the principles (of Islam) which characterised Caliph Umar's regime".(36)

اور پاکستان کا یہی تصور تھا جس کی وضاحت کرتے ہوئے قائداعظم نے کسی شخص کے اس سوال پر کہ : "Who is the author of Pakistan?" بے ساختہ فرمایا : Every Musalman- لیکن علامہ اقبال کے مقاصد تو حصول پاکستان اور اسلامی بلاک کے قیام سے بھی بہت آگے تھے- یہ مقاصد عصر حاضر میں اسلام کے عالمی کردار سے تعلق رکھتے ہیں جن سے آج پاکستانی نوجوان بالکل بے خبر ہیں، اور جو ہمارے علما کے روایتی تصور اسلام سے بلند تر تخیل پر مبنی ہیں-

مظہر الدین صدیقی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اسلام کی مذہبی زندگی اور روحانی اقدار کا جو تصور اقبال کے ہاں پایا جاتا ہے وہ اس قدر انوکھا اور منفرد ہے کہ اس میں خود مسلمانوں کی اکثریت بھی شریک ہونے کو تیار نہیں- چنانچہ وہ بڑی تحدی سے یہ کہتے ہیں کہ علامہ اقبال کا تصور اسلام تقلید پسند مذہبی حلقوں کے تصور اسلام سے بالکل ایک مختلف تصور ہے-(۳۷)

ہمارے خیال میں مظہر الدین صدیقی کی یہ بات اس اعتبار سے درست ہے کہ علامہ اقبال کے نزدیک اسلام کسی خاص قوم کا مذہب نہیں بلکہ یہ اللہ تعالٰی کی وہ رحمت عام ہے جو رحمتہ اللعالمین ﷺ کے واسطے سے پورے عالم انسانی کو محیط ہے- یہی وجہ ہے کہ ان کا تصور اسلام، دین کے روایتی تصور سے مختلف ہے-

حرف بد را برلب آوردن خطاست
کافر و مومن ہمہ خلق خدا ست
آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقام آدمی

آدمی از ربط و ضبط تن بہ تن
بر طریق دوستی گامے بزن
بندہ عشق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق

یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو اپنے انتقال سے چار ماہ پہلے سال نو کے پیغام میں جو آل انڈیا ریڈیو کے لاہور اسٹیشن سے نشر کیا گیا علامہ نے احترام انسانیت پر زور دیتے ہوئے فرمایا تھا:

"دراصل انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے اور جب تک تمام دنیا کی علمی قوتیں اپنی توجہ کو محض احترام انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کر دیں یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی بنی رہے گی۔ کیا ہم نے نہیں دیکھا کہ ہسپانیہ کے باشندے ایک نسل، ایک زبان، ایک مذہب اور ایک قوم رکھنے کے باوجود محض اقتصادی مسائل کے اختلاف پر ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں اور اپنے ہاتھوں اپنے تمدن کا نام و نشان مٹا رہے ہیں☆ اس ایک واقعہ سے ظاہر ہے کہ قومی وحدت بھی ہرگز قائم و دائم نہیں، وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے جو رنگ و نسل و زبان سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو مٹایا نہ جائے گا، جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا، جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو نہ مٹایا جائے گا اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کرسکے گا اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندہ معنی نہ ہوں گے۔"(۳۳)

انسان دوستی کا یہ مسلک علامہ کے تصور دین کا مرکزی نکتہ اور سب سے زیادہ

☆ ان دنوں ہسپانیہ میں خانہ جنگی ہو رہی تھی۔

نمایاں پہلو ہے جو عمر بھر ان کے ذہن پر چھایا رہا۔ خطبہ الہ آباد (دسمبر ۱۹۳۰ء) میں آپ نے پہلی بار ہندوستان کی تقسیم کا سوال اٹھایا تھا لیکن خطبہ کے اس پہلو پر ہم بہت کم غور کرتے ہیں کہ اس میں ہندو کے غلبے کا خوف نہیں جھلکتا بلکہ "شمال مغربی ہندوستان میں ایک منظم اسلامی ریاست" قائم کرنے کی تجویز پیش کرنے سے پہلے آپ نے ملک کے سیاسی مسائل پر جو اصولی بحث کی ہے اس میں بار بار اسلام کے "عالمگیر مطمح نظر" "عالمگیر نظام اخلاق" "عالمگیر نظام سیاست" اور "انسانیت پرور مقاصد" کا ذکر کیا ہے اور صاف صاف الفاظ میں کہا ہے کہ وہ اس بات کے آرزو مند ہیں کہ مسلمانان ہند کے تمام سیاسی فیصلے "اسلام کی عالمگیر حقیقت کے بنیادی اصول" کے پابند ہوں اور اس کے ساتھ ہی اس بات کا بھی دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سلسلے میں "ایک خاص بصیرت" سے نوازا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"میں کسی جماعت کا رہنما نہیں، نہ کسی رہنما کا پیرو کار ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسلام، اسلامی فقہ و سیاست، تہذیب و تمدن اور ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس مسلسل اور متواتر تعلق کی بدولت، جو مجھے تعلیمات اسلامی کی روح سے ہے، جیساکہ مختلف زبانوں میں اس کا اظہار ہو رہا ہے، میں نے اس بارے میں ایک خاص بصیرت پیدا کر لی ہے کہ ایک عالمگیر حقیقت کے اعتبار سے اسلام کی حیثیت کیا ہے؟ لہٰذا یہ فرض کرتے ہوئے کہ مسلمانان ہندوستان بہرحال اپنی اسلامی روح کو برقرار رکھنے پر مصر ہیں میں کوشش کروں گا کہ آپ کے فیصلوں کی رہنمائی کے بجائے اس بنیادی اصول کا احساس پیدا کر دوں جس پر میری رائے میں ہمارے تمام فیصلوں کا انحصار ہونا چاہیے۔"(۳۹)

لیکن علامہ اقبال اور قائداعظم کی وفات کے بعد "ایک عالمگیر حقیقت کے اعتبار سے اسلام کی حیثیت" کا وہ "بنیادی اصول" فراموش کر دیا گیا جس نے ان بانیان پاکستان کو اس کے قیام کا جواز فراہم کیا تھا بلکہ جو "سم افرنگ" کا تریاق بھی تھا۔

ضرب کلیم کا پہلا ایڈیشن جولائی ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا اور یہ وہ کتاب ہے جس کے نام کے نیچے آپ نے "اعلان جنگ دور حاضر کے خلاف" کے توضیحی الفاظ خاص طور پر

درج کئے۔ لیکن کفر و ایمان کی یہ جنگ کس مقصد کے لیے لڑی جائے، اسے سمجھنے کے لیے "ضرب کلیم" ہی کی ایک چھوٹی سی نظم، جو "کافر و مومن" کے عنوان سے صرف تین اشعار پر مشتمل ہے، پر غور کیجئے:

کل ساحل دریا پہ کہا مجھ سے خضر نے
تو ڈھونڈ رہا ہے سم افرنگ کا تریاق
اک نکتہ مرے پاس ہے شمشیر کی مانند
برندہ و صیقل زدہ و روشن و براق
کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

گویا علامہ اقبال کے نزدیک کافر و مومن کی پہچان کی کسوٹی ہی یہ ہے کہ جو فرد آفاقی نکتہ نظر رکھتا ہو وہ مومن ہے اور جو رنگ، نسل اور قوم کے امتیازات پر اصرار کرتا ہو کافر ہے، اسی لیے آپ نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ مسلمان اپنی سوچ میں عالمی اور آفاقی نقطہ نظر پیدا کریں، اپنی ملت میں بھی یہی نقطۂ نظر اپنائیں اور عالم انسانیت کو بھی اسی نقطۂ نظر سے دیکھیں۔ ان کی پوری سیاسی فکر کا یہ بنیادی نکتہ ہے کہ وہ داخلی اور خارجی اعتبار سے اسلام کو ایک آفاقی دین اور مسلمان کو مرد آفاقی خیال کرتے ہیں۔

نہ چینی و عربی وہ نہ رومی و شامی
سما سکا نہ دو عالم میں مرد آفاقی

انہیں یہ بھی یقین تھا کہ اگر مسلمانوں کے اندر آفاقی نقطہ نظر پیدا ہو جائے تو ان میں آفاق گیری کا ولولہ پیدا ہوگا اور وہ اپنے اس عالمی کردار کا از سر نو شعور حاصل کر لیں گے جسے انہوں نے مدت ہوئی فراموش کر رکھا ہے۔

دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اٹھتے
نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو انداز آفاقی

اور یہ کہ آفاقی نقطہ نظر صرف ایک خدا شعور ذہن میں ہی پیدا ہو سکتا ہے جسے علامہ اقبال خودی کا نام دیتے ہیں کیونکہ خدا کی محبت ہی انسان کو رنگ، نسل اور قوم

کے بندھنوں سے آزاد کر کے اس میں آفاق گیری کا وہ جذبہ بیدار کر سکتی ہے جس میں الخلق عیال اللہ کے مطابق پوری نوع انسان ایک ملت آدم کی صورت میں نظر آنے لگتی ہے۔

نہ میں اعجمی نہ ہندی نہ عراقی و حجازی
کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ "حکمت افرنگ" میں سرے سے یہ اہلیت اور تاثیر موجود ہی نہیں کہ وہ وحدت انسانی کے خواب کو شرمندہ تعبیر کر سکے اسی لیے عالمی امن کے لیے اس کی تمام کوششیں اور تمام تدابیر رائیگاں گئی ہیں اور آئندہ بھی رائیگاں جاتی رہیں گی کیونکہ یہ رنگ، نسل اور وطن کی بنیاد پر الگ الگ قومیتوں کے حصار قائم رکھنے پر اصرار کرتی ہے۔ اس حکمت افرنگ کے تحت "جمعیت اقوام" تو قائم ہو سکتی ہے لیکن "جمعیت آدم" قائم نہیں کی جا سکتی:

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدت آدم
تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملت آدم
مکے نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام
جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم

علامہ اقبال نے اس حقیقت پر بار بار زور دیا ہے کہ ایک عالمگیر انسانی برادری کی صورت گری کی صلاحیت صرف اور صرف اسلام میں ہی پائی جاتی ہے کیونکہ وہ ایک طرف تو وحدت الہ اور وحدت آدم کے عقائد کی بنیاد پر دنیا کے تمام انسانوں کو برابری کی سطح پر لا کر واحد معیار فضیلت و کرامت تقویٰ کو قرار دیتا ہے اور دوسری طرف اس عالم گزراں کے حالات و واقعات پر گہری نگاہ رکھتے ہوئے فکر آخرت کو انسان کی سوچ کا دائمی عنصر بنا دیتا ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک اسلام کی یہی دو خصوصیات ہر زمانے میں عالمی انسانی اخوت کی پائیدار اساس رہی ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"A social system which exists with the express object

of doing away with all the distinctions of caste, rank and race; and which, while keeping a watchful eye on the affairs of this world, fosters a spirit of otherworldiness so absolutely essential to man in his relations with other neighbours."(40)

اسلام روز اول ہی سے ایک آفاقی دین ہے۔ چودہ سو سال پیشتر جب اس کرہ ارض پر اسلام کا آفتاب طلوع ہوا تو اس نے جس خدا کی بندگی کی دعوت دی اسے رب العالمین، الہ الناس، ملک الناس، رب الناس کے ناموں سے پکارا، جس شخصیت کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ سے تعلق اور محبت پیدا کرنے کا واحد ذریعہ ٹھہرایا اسے رحمۃ للعالمین ﷺ، اور کافۃ للناس جیسے خطابات سے نوازا اور سلسلہ نبوت کو ختم کر کے آخری الہامی کتاب یعنی قرآن حکیم کو نبوت کا بدل قرار دے کر اس کے لیے ذکر للناس اور بصائر للناس کے الفاظ استعمال کئے اور امت مسلمہ کو شہداء علی الناس کا فریضہ تفویض کیا۔ ظاہر ہے کہ اسلام اپنی روح اور ساخت کے اعتبار سے ایک آفاقی دین ہے جو ایک عالمی نظام قائم کرنے کا آرزو مند ہے، چنانچہ عالمی اور بین الاقوامی معاملات میں مسلمانوں کو سیاسی اعتبار سے حساس بنانے کے لیے قرآن حکیم نے ایک انتہائی موثر اسلوب بیان اختیار کیا ہے۔ سورۂ روم کی ابتدائی چند آیات میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی اس فکرمندی کو بیان کیا ہے جو انھیں ایرانیوں کے مقابلے میں رومیوں کی شکست و ہزیمت کی وجہ سے لاحق ہوگئی تھی۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ان آیات کا نزول بعثت کے اس ابتدائی زمانے میں ہوا جب مسلمان ابھی مٹھی بھر تھے اور مکہ معظمہ میں کفار کے ظلم و تشدد کا شکار ہونے کی وجہ سے انتہائی کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن اس عالم بیکسی و بیچارگی میں بھی وہ گردوپیش کے بین الاقوامی حالات میں تاریخی و سیاسی تبدیلیوں کے بارے میں گہرا احساس رکھتے تھے حتیٰ کہ رومیوں کے مغلوب ہو جانے سے ان کے دل ملول ہوگئے۔ صورت حال ایسی تھی کہ ایک طرف ایرانی تھے اور دوسری طرف رومی، پھر خود مسلمان کفار مکہ کے ظلم و جور کا شکار تھے۔ لیکن وہ اپنے شدید مقامی مسائل میں گھرے ہونے کے باوجود بین الاقوامی حالات کے بارے میں بے حد حساس تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پہلے انھیں بین الاقوامی

سیاست کے بارے میں اور پھر اندرون ملک کی سیاست کے بارے میں خوشخبری دی۔ گویا شروع سے ہی مسلمانوں کی سیاسی تربیت آفاقی خطوط پر کی جا رہی تھی:

غلبت الروم ○ فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم سیغلبون ○ فی بضع سنین ○ للہ الامر من قبل ومن بعد ویومئذ یفرح المومنون ○

علامہ اقبال قرآن حکیم میں گہری بصیرت رکھنے کی وجہ سے اسلام کے آفاقی مطمح نظر کو سیاسی جدوجہد کا بنیادی اصول قرار دیتے تھے اس لیے دنیا کے معاملات کو سنوارنے میں مسلمانوں کو موثر کردار ادا کرنے کے لیے پکارتے رہے۔

ڈکنسن نے جب علامہ اقبال کی شاعری پر اعتراض کیا کہ یہ شاعری اپنے اسلامی تشخص کی بنا پر آفاقی شاعری نہیں قرار دی جاسکتی تو آپ نے فقط یہ کہا کہ ڈکنسن اسلام کی اصل حیثیت سے بے خبر ہے ورنہ اس قسم کے بے بنیاد اعتراض کی گنجائش نہ تھی۔ چنانچہ آپ نے نکلسن کے نام اپنے ایک خط میں ڈکنسن کے حوالے سے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھا:

> Nor is the spirit of Islam so exclusive as Mr. Dickenson thinks. In the interests of a universal unification of mankind the Quran ignores their minor difference and says : "Come let us unite on what is common to us all". I am afraid the old European idea of a blood thirsty Islam is still lingering in the mind of Dickenson. All men and not Muslims alone are meant for the kingdom of God on earth provided they say good bye to their idols of race and nationality and treat one another as personalities. Leagues, mandates like the one described in democracy can never bring salvations to mankind.(41)

اسلام کی ساخت میں وحدت انسانی کا نظریہ اتنا گہرا اترا ہوا ہے کہ مسلمانوں کو اس بات پر بھی اصرار نہیں کہ اعلیٰ انسانی مقاصد کے حصول کی جدوجہد میں غیر مسلم ہی مسلمانوں کا ساتھ دیں بلکہ وہ خود بھی ہر ایسے کام میں شریک ہونے کے لیے بیتاب رہتے ہیں جس کا مقصد انسانیت کی فلاح و بہبود ہو اور جس سے دنیا میں امن و آشتی قائم کرنے میں مدد ملے۔ سیرت کی کتابوں میں حلف الفضول کے نام سے ایک ایسے

واقعہ کا ذکر ملتا ہے جو بعثت نبوی سے قبل پیش آیا تھا۔ یہ معاہدہ ایک مظلوم کی پکار سن کر قبائل قریش کے نمائندہ افراد کے درمیان اس غرض سے طے پایا تھا کہ مکہ میں کوئی بھی مظلوم پایا جائے، خواہ مقامی ہو یا غیر مقامی، اس کی مدد اور پشت پناہی کی جائے گی اور اس کا حق اسے دلوایا جائے گا۔ اس معاہدے میں رسول اللہ ﷺ اگرچہ ایک ایسے وقت میں شریک ہوئے جب آپ ؐ ابھی رسالت سے مشرف نہیں تھے لیکن تاحین حیات اس معاہدہ کی قدرو منزلت واضح کرنے کے لیے فرمایا کرتے تھے کہ اگر مجھے آج بھی کسی ایسے معاہدے میں شرکت کی دعوت دی جائے تو میں اس پر لبیک کہوں گا۔

اسلام میں احترام آدمی کا مقام یہ ہے کہ نبی ﷺ کے زمانے میں نجران سے جو پادری مناظرہ کے لیے مدینہ آئے نہ صرف یہ کہ انہیں مسجد نبوی میں ٹھہرایا گیا بلکہ جب وہ عبادت کے لیے مسجد سے باہر جانے لگے تو آپ ؐ نے انہیں روک لیا اور مسجد کے اندر ہی انہیں اپنے مخصوص مذہبی طریقے کے مطابق عبادت کی اجازت دے دی۔ غرض اسلام کے تہذیبی لاشعور میں رواداری، وسعت قلبی اور فراخ حوصلگی جیسی اقدار کی جڑیں بہت گہری ہیں اور بعض اوقات تو ان کا اظہار عجیب و غریب صورتوں میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر علی مزروعی اپنے ایک مضمون میں موجودہ زمانے کی ایک تعجب انگیز مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "I was quite intrigued in my own country in Kenya for it has an Islamic Party which the government refuses to register. It is very unusual Islamic party, for it states explicitly that one does not have to be a Muslim to be a member, a supporter or an office holder. One has just to subscribe to particular Muslim values regarded fundamental to its program. So it is not a party for Muslim fraternity but of Muslim values. A man can belong to some other religion provided that his or her values converge with Islam.(42)

اس لیے علامہ اقبال اگر 'کافر و مومن ہمہ خلق خداست' کے طریق دوستی پر گامزن ہوتے ہوئے "می شود ہر کافر و مومن شفیق" کا اصول اپناتے ہیں تو ان کا یہ

اصول ہمارے روایتی علما کے رویہ کم آمیزی کے خلاف ایک طرح کا احتجاج ہے جو انہیں یا ایہا المومنون کی سطح تک محدود کر دیتا ہے اور یا ایہا الناس کی سطح پر آنے سے روکے رکھتا ہے' کیونکہ ان کے تصور دین کے مطابق یہ دنیا دارالحرب اور دارالاسلام میں بٹی ہوئی ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی جیسے روشن خیال عالم دین نے الجہاد فی الاسلام میں یہ موقف اختیار کیا تھا کہ دنیا کی وہ تمام غیر مسلم اقوام جن سے مسلمان قوم کا تحریری شرعی معاہدہ نہ ہو حربی اور برسر جنگ قومیں شمار ہوتی ہیں' چنانچہ مولانا اخلاق حسین قاسمی نے اس پر حیرت ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مولانا مودودی نے اپنی اس کتاب میں موادعت (جنگ اور دشمنی) اور عدم موادعت کے درمیان کسی تیسری صورت یعنی Coexistance کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہنے دی(☆) لیکن پاکستان بننے کے بعد آپ کے فکر میں اعتدال پیدا ہوا اور آپ نے یہ فتویٰ دیا کہ پاکستان کے غیر مسلم (یعنی ہندو' سکھ' عیسائی) برصغیر کی آزادی کے باہمی معاہدہ کے ذریعہ پاکستان کے برابر درجہ کے شہری ہیں اور ان سے جزیہ نہیں لیا جاسکتا۔(۲۳)

مولانا مودودی نے نظریہ قومیت کی حد تک تو علامہ اقبال سے اتفاق کیا تھا لیکن اسلام کے انسان دوستی کے نصب العین Humanitarian ideal کے سلسلے میں علامہ اقبال کے خیالات کا اثر نہیں لیا اور انسان دوستی میں مولانا ابوالکلام آزاد' اتنی دور نکل گئے کہ اسے وسعت دیتے دیتے وطنی قومیت کو گویا عقیدہ بنا لیا اور پھر اس کا جواز پیدا کرنے کے لیے یہ موقف اختیار کیا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں ہیں۔ اصل مذہب تو خدا پرستی اور نیک اعمال ہیں' فرق صرف شرع اور منہاج کا ہے لہٰذا اگر مختلف مذاہب کے پیروکار اپنے اپنے بانیاں مذہب کی تعلیمات پر عمل کرنے لگ جائیں تو مقصد پورا ہو جائے گا۔ کسی شخص کے مسلمان ہونے یا عیسائی ہونے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ گویا مسلمان ہونا غیر ضروری ٹھہرا۔ لیکن جب اسلام کی نفی کے بعد نظم اجتماع انسانی کی ضرورت کے تحت وطنیت کی ضرورت پیش آئی تو اسے مولانا آزاد نے اس قدر اہمیت دی کہ ان کے نزدیک وطنی قومیت کو عقیدہ کا درجہ حاصل ہوگیا۔

☆ ان حالات میں بھارتی مسلمانوں کی مشکلات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

علامہ اقبال کا موقف ان دونوں سے الگ ہے اور ان کے نزدیک وطنی قومیت کا نظریہ Humanitarian ideal کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہی نہیں بلکہ اسلام اور امت مسلمہ کے لیے سم قاتل بھی ہے۔ اس مسئلہ پر مولانا حسین احمد مدنی سے علامہ اقبال کی جو فکری معرکہ آرائی ہوئی اس میں آپ نے اپنے خیالات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

"The history of man is an infinite process of mutual conflicts, sanguine battles and civil wars. In these circumstances can we have among mankind a constitution, the social life of which is based upon peace and security? The Quran's answer is: Yes, provided man takes for his ideal the unity of God in the thoughts and actions of mankind. The search for such an ideal and its maintenance is no miracle of political manoeuvering. It is peculiar greatness of the Holy Prophet that the self-invented distinctions and superiority and complexes of nations of the world are destroyed and there comes into being a community which can be styled "ummat-am muslimat-alak" (a community submissive to Thee, (2 : 128) and to whose thoughts and actions the divine dictate "Shuhada 'al-annas" (a community that bears witness to the truth before all mankind (2 : 143) justly applies.(44)

اپنے آخری ایام میں علامہ اقبال کی یہ شدید خواہش تھی کہ وہ جدید دور کے انسان کو اسلام سے متعارف کرانے کے لیے ایک ایسی کتاب لکھ جائیں جس سے اسلام کی روح اور اس کے پیغام کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہو جائے۔ وہ یہ کتاب تو نہ لکھ سکے لیکن اس کا ایک خاکہ میاں محمد شفیع کو لکھوا گئے۔ اس میں دو مقامات پر Deracialisation of mankind کو قرآن حکیم کی تعلیمات کا ایک بنیادی مقصد قرار دیا ہے جس سے انسانی معاشرہ کو امن اور سلامتی (external peace) کا گہوارہ بنانے کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "اسلام کا مقصود فقط ملت آدم" کا نظریہ ان کے نزدیک کیا اہمیت رکھتا تھا۔

علامہ اقبال جب اسلام کی آفاقی وسعتوں میں پرواز کرتے ہیں تو اسلام کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز نہیں کرتے' بلکہ ان حدود کے احترام میں وہ اس قدر محتاط اور حساس ہیں کہ ان کی خلاف ورزی پر معاصرین کے ساتھ ان کے کئی معرکے ہوئے۔ مولانا حسین احمد مدنی نے جب یہ کہا کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں تو ان کے "تقویٰ و تدین" کا لحاظ رکھے بغیر سخت ترین الفاظ میں سرزنش کی۔ حالانکہ علامہ اقبال علماء اور صوفیا کا ادب اور احترام کیا کرتے تھے۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کیا تو آپ نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر واشگاف الفاظ میں ان کے پیروکاروں کو غداران اسلام اور مرتد قرار دیا۔ غرض یہ کہ دینی حدود کی پاسداری اور پاسبانی میں "مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست' کا رہنما اصول ہمیشہ پیش نظر رکھا اور اسلام کی آفاقیت کی توضیح و تشریح میں احتیاط کا دامن کبھی آپ کے ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تصور اسلام علماء کے روایتی تصور سے کتنا ہی مختلف سہی لیکن انہوں نے اس تصور میں اسلام کی بنیادی اقدار اور حدوود سے سرمو تجاوز نہیں کیا۔

علامہ اقبال نے نظریہ وطنیت کے خلاف جہاد میں سب سے زیادہ زور اسلام کی آفاقیت پر دیا ہے اور عصر حاضر کی لادینیت اور الحاد کے خلاف توحید کا پرچم بلند کیا۔

اندریں عصر کہ لاگفت من الا گفتم
ایں چنیں دیدہ رہ بیں بہ شب تار کجاست

چنانچہ ان کا منتہائے مقصود پاکستان تک محدود نہیں۔ انہوں نے اسلام کی آفاقی وسعتیں دریافت کی ہیں جن میں توحید کی اساس پر امن و سلامتی کا نیا جہان تعمیر کرنا چاہتے ہیں اور اس جہان کی تعمیر میں پوری دنیائے انسانیت کو شریک کرنا چاہتے ہیں' لیکن اسلام کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے نہ کہ ان سے تجاوز کرتے ہوئے اور انہیں پامال کرتے ہوئے۔ انہیں اس بات کا پورا پورا احساس اور اس پر اصرار ہے کہ جس قوم کو عالمگیر امن اور جہانگیر اخوت کے لیے دنیا کی امانت کا فریضہ انجام دینا ہو اسے رواداری' وسیع القلبی اور وسعت فکری کی اقدار کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ خود اپنی مذہبی سرحدوں کی حفاظت اور اندرونی استحکام سے کبھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ رواداری کے مسئلہ پر آپ کے خیالات نہایت فکر انگیز اور سبق آموز

ہیں، فرماتے ہیں:

"رواداری کی روح ذہن انسانی کے مختلف نقاط نظر سے پیدا ہوتی ہے۔ گبن کہتا ہے کہ "ایک رواداری فلسفی کی ہوتی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر صحیح ہیں۔ ایک رواداری مورخ کی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر غلط ہیں۔ ایک رواداری ایسے شخص کی ہے جو ہر قسم کے فکر و عمل کو روا رکھتا ہے کیونکہ وہ ہر قسم کے فکر و عمل سے لاتعلق ہوتا ہے۔ ایک رواداری ایک کمزور آدمی کی ہے جو محض کمزوری کی وجہ سے ہر قسم کی ذلت کو جو اس کی محبوب اشیا یا اشخاص پر مسلط کر دی جائے برداشت کر لیتا ہے۔" ــــ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ اس قسم کی رواداری، اخلاقی قدر سے معرا ہوتی ہے۔ جو شخص ایسی رواداری کا مرتکب ہوتا ہے اس سے اس کے روحانی افلاس کا اظہار ہوتا ہے، حقیقی رواداری عقلی اور روحانی وسعت سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ رواداری ایک ایسے شخص کی ہوتی ہے جو روحانی حیثیت سے قوی ہوتا ہے اور اپنے مذہب کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے دوسروں کے مذہب کو روا رکھتا ہے اور ان کی قدر کر سکتا ہے۔"(۴۶)

علامہ محمد اقبال نے رواداری کی جو تشریح کی ہے اس سے قرآن کے الفاظ "اشداء علی الکفار" کا مفہوم بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے۔ سیکولر نیشنلزم، سیکولر سوشلزم یا سیکولر جمہوریت کے نام پر نظم اجتماع انسانی کے حوالے سے جب مسلمانوں سے وسیع القلبی، وسعت نظری اور رواداری کا تقاضا کیا جاتا ہے تو درحقیقت اس کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا کہ مسلمانوں کو اپنی بہترین اقدار سے محروم کر دیا جائے۔ اس کی تازہ ترین مثال یہ ہے کہ حال ہی میں صدر ترکیہ سلیمان ڈیمرل سے ایک معروف پاکستانی صحافی نے انٹرویو کیا جو ایک اردو ہفت روزہ میں شائع ہوا۔ انٹرویو میں ترکی میں مسلمان عورت کے سر ڈھانپنے کا مسئلہ اٹھایا گیا۔ انٹرویو کرنے والے کا سوال تھا کہ حیا کی اسلامی قدر کی پاسداری میں اگر کوئی عورت ترکی میں سر ڈھانپنا یا سکارف پہننا چاہے تو کیا ترکی کی نیشنلسٹ حکومت اس کی اجازت دے گی؟ اس پر صدر ترکیہ کا

جواب تھا: ہماری مملکت مذہبی نہیں' ہم سیکولرزم اور جمہوریت کے اصولوں پر اپنی اجتماعی زندگی منظم کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں اور ہمارا قانون اور نظم سیکولرزم پر استوار ہے۔" سوال کیا گیا کہ مذہب سے قطع نظر اگر کوئی عورت محض اپنے جمہوری حق بلکہ بنیادی انسانی حقوق کو بروئے کار لاتے ہوئے سر ڈھانپنا چاہے یا سکارف پہننے کا فیصلہ کر لے تو کیا حکومت اس کے حق کو تسلیم کرے گی؟ صدر جمہوریہ ترکیہ کا جواب تھا۔ "ہمارے ہاں سکارف پہننا یا سر ڈھانپنا جمہوری یا انسانی حقوق کا مسئلہ نہیں بلکہ ایک سیاسی مسئلہ ہے ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے۔" گویا ایک سیکولر' نیشنلسٹ' جمہوری ملک میں سیاسی حقوق' انسانی حقوق اور مذہبی حقوق کے بارے میں تمام فیصلوں کا اختیار سیکولر حکومت کو ہے اور اس کے باوجود صدر جمہوریہ ترکیہ فرماتے ہیں کہ "ترکی مسلمانوں کا ملک تھا' ہے اور رہے گا۔"(۳۶)

قومی وطنیت اور سیکولر جمہوریت میں اسلام ایک کمزور عنصر کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے حتیٰ کہ رفتہ رفتہ اسلامی معاشرتی اقدار کی حفاظت اور فروغ کے امکانات بھی معدوم ہو جاتے ہیں' ایسے ملک میں اسلام کے بطور ایک عالمی تحریک ابھرنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ اس طرح بقول اقبال سیکولر جمہوریت اور وطنی قومیت مذہب کا کفن بن کر رہ جاتی ہے۔ انہی خطرناک مضمرات کی بنا پر علامہ اقبال مسلمانوں کو وطنی قومیت کے نظریے سے حذر کی بار بار تلقین کرتے ہیں۔

بلاشبہ علامہ اقبال نے توقع ظاہر کی تھی کہ جس ملک میں مسلمان اکثریت میں ہوں وہاں نیشنلزم اسلام سے ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے کیونکہ وہاں جمہوری عمل کے ذریعے اسلامی کلچر کی حفاظت کی جاسکتی ہے۔ لیکن ترکی کی مثال اور صدر جمہوریہ ترکیہ کے مندرجہ بالا خیالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان اکثریت والے ملک میں بھی اگر سیکولرزم اور نیشنلزم باہم شیرو شکر ہو جائیں تو اسلام کے لیے ایسی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں کہ اسلامی معاشرتی اقدار کی حفاظت تک ممکن نہیں رہتی چہ جائیکہ وہ عالمگیر وحدت انسانی کے اسلامی سیاسی نصب العین کے لیے کوئی موثر کردار ادا کرسکے۔ چنانچہ آپ نے نکلسن کے نام اپنے خط میں یہ تشویش ظاہر کی تھی کہ اسلامی دنیا کے اندر بھی نسل پرستی اور وطن پرستی کو فروغ دیا جا رہا ہے اور وطن پرستی ترقی پذیر ہے اس لیے انہوں

نے اپنا اولین مخاطب مسلمانوں کو ہی بنایا ہے تاکہ وہ نسل' ذات پات' برادری' رنگ' زبان اور ملک کے تعصبات میں مبتلا ہو کر اپنے عالمی سیاسی نصب العین سے غافل نہ ہو جائیں جو پوری دنیا کے انسانوں کو ایک ملت ادم کی شکل میں دیکھنے کا آرزو مند ہے۔

علامہ اقبال وطن کے ساتھ محبت کو ایک فطری جذبہ کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں اور ان کے نزدیک اپنے ملک کے باشندوں کی فلاح و بہبود میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا حب الوطنی کا ایک قدرتی تقاضا ہے' چنانچہ اس اعتبار سے مسلمان کسی ملک میں خواہ اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں اپنے ہموطنوں میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اس عالمی سیاسی نصب العین سے کبھی غافل نہیں ہوسکتے جسے علامہ اقبال نے "اخوت کی جہانگیری اور محبت کی فراوانی" سے تعبیر کیا ہے۔ اسلام کا مشن پوری دنیا کو امن اور سلامتی کا گہوارہ بنانا ہے۔ لہذا وطنیت (Nationalism) اور حب الوطنی (Patriotism) دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ نظریہ وطنیت (Nationalism) سے انکار کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم حب الوطنی سے عاری ہیں بلکہ ہمارا موقف تو یہ ہے کہ ہم اپنے ملک کے محب وطن شہری ہونے کے ساتھ ساتھ اس کرہ ارض کے انسان دوست شہری بھی ہیں۔ ایک محلّہ' ایک شہر' ایک صوبہ کا باسی ہونے کے ساتھ ساتھ اگر میں ایک ملک کا باشندہ بھی کہلا سکتا ہوں تو ایک ملک کا شہری ہونے کے ساتھ ساتھ اس کرہ ارض کا باشندہ ہونے سے کیوں انکار کیا جائے جہاں میرے اسلامی عقیدہ کے مطابق انسان کو خلیفتہ الارض مقرر کر کے لا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا کی ذمہ داری سونپی گئی ہے اور اس ذمہ داری کو نباہنے کے لیے میں اسلامی دنیا کے علاوہ پوری دنیا کے انسانوں کو شریک کرنا چاہتا ہوں کیونکہ خلیفہ الارض حضرت آدم کو مقرر کیا گیا تھا جو بنی نوع انسان کے باپ تھے اور ان کی اولاد ہونے کے ناطے سے دنیا کے تمام انسان اس شرف کا استحقاق رکھتے ہیں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں :

"All men and not Muslims alone are meant for the Kingdom of God on earth provided they say good bye to their ideals of race and nationality and treat one another as personalities"(47)

اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ وطنی قومیت کے خلاف علامہ اقبال کے جہاد کو عالمی تناظر میں دیکھنے سے ہی ان کا سیاسی نصب العین سمجھ میں آسکتا ہے اور محض ہندوستان کے تاریخی تناظر میں محدود کر دینے سے ان کے حقیقی سیاسی مقاصد سے آگاہی ممکن نہیں۔ پاکستان کی نئی نسل کو اقبال کے اس آفاق گیر سیاسی نصب العین کے حوالے سے ہی پاکستان کی غرض و غایت سمجھائی جاسکتی ہے اور انہیں اچھے پاکستانی بنایا جاسکتا ہے۔ پاکستانی قوم پر اپنی پچاس سالہ غفلتوں کی وجہ سے جو مایوسی اور مردنی طاری ہے اس سے نکال کر قوم میں امید و عزم کی روشنی اور حرارت صرف اسی طرح پیدا کی جاسکتی ہے کہ انہیں بتلایا جائے کہ پاکستان کا ایک عالمی کردار ہے اور اس کی ایک تقدیر ہے جس کے لیے مشیت ایزدی نے دنیا کے نقشے پر اسے وجود بخشا ہے۔

جس عظیم تر اور وسیع تر پاکستان کا خواب علامہ اقبال نے دیکھا تھا اس کا نقشہ آپ نے اپنی ایک غزل میں یوں لکھا ہے:

فروغ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے
زمین از کوکب تقدیر ما گردوں شود روزے
خیال ما کہ او را پرورش دادند طوفانہا
ز گرداب سپہر نیلگوں بیروں شود روزے
یکے در معنی آدم نگر! از من چہ می پرسی
ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے
کہ یزداں را دل از تاثیر او پر خوں شود روزے

اس دلفریب غزل میں، جس کا ایک ایک شعر وجد آفریں ہے، پاکستان کا وجود پوری دنیا کو محیط نظر آتا ہے۔ اگر پاکستانی قوم اپنے عالمی کردار سے واقف ہو کر آج بھی اپنے فکر اور عمل کی سمت درست کر لے تو پاکستان سمٹنے اور سکڑنے کے بجائے دنیا کے آخری کناروں تک پھیل سکتا ہے۔

خلاصہ کلام

علامہ اقبال کے افکار و نظریات کی روشنی میں غائت پاکستان کو مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ حضرت علامہؒ کے پیش نظر ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ ریاست کے قیام کا مقصود اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ اسلامی تہذیب کی وحدت انگیز قوت کو باطل نظریات سے محفوظ رکھ کر، مسلمانوں کے ملی شعور کو پختہ اور ان کے آفاق گیر فکر کو فروغ دیا جائے تاکہ وہ عصر حاضر میں اسلام کے عالمی کردار کو ادا کرنے کے قابل ہو جائیں۔ اور پھر یہیں سے ایک ایسی عالمی تہذیبی تحریک کا آغاز کیا جائے جو بنی نوع انسان کو رنگ، نسل، زبان اور وطن کی حدبندیوں سے آزاد کر کے متحد کر دے تاکہ عقیدہ توحید کی بنیاد پر یہ دنیا روحانی الذہن لوگوں کی ایک عالمی بستی بن جائے جہاں امن و سلامتی کا دور دورہ ہو اور اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی سے یہ جہاں روشن ہو جائے۔ پاکستان کا مقصد آفاقی انداز فکر رکھنے والے مسلمان پیدا کرنا تھا۔

کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک خیالی اور مثالی دنیا (Utopia) کا تصور ہے جسے حقیقت میں تبدیل کرنا اگر بالکل ناممکن نہیں تو سخت دشوار اور محال ضرور ہے۔ اسے علامہ اقبال کا شاعرانہ خواب کہہ لیجئے لیکن حقیقت یہی ہے کہ علامہ اقبال اس نئی ریاست میں ایک ایسا ہی نیا جہان تعمیر کرنے کے خواہش مند تھے۔ ان کا قول ہے کہ

> Nations are born in the hearts of poets; they prosper and die at the hands of politicians.(48)

یعنی قومیں شاعروں کے دلوں میں جنم لیتی ہیں اور سیاست دانوں کے ہاتھوں پھلتی پھولتی اور موت سے ہمکنار ہوتی ہیں۔ اس قول کا اطلاق اگر پاکستان کی تاریخ پر کیا جائے تو یوں نظر آتا ہے کہ ایک شاعر یعنی علامہ اقبال نے ہندی مسلمانوں کے لیے اسلام کے عصری تقاضوں کے مطابق ایک نصب العین متعین کر کے انہیں بحیثیت قوم ایک نیا جنم دیا۔ اور ایک سیاستدان اور مدبر یعنی قائداعظم محمد علی جناح نے سخت مشکلات کے باوجود ایک شاعر کے خواب کو حقیقت میں تبدیل کر دکھایا لیکن ان کے بعد جو سیاستدان آئے انہوں نے اپنی پچاس سالہ غفلتوں، کوتاہیوں اور مسلسل بداعمالیوں

سے پاکستان کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔

پاکستان کے سیاستدانوں میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی بڑے باصلاحیت سیاستدان تھے جن میں غائت پاکستان کے شعور کو زندہ و بیدار رکھنے کی اہلیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ اگر وہ علامہ اقبال کی سیاسی حکمت عملی سے اختلاف نہ کرتے تو ان کی صلاحیتوں سے پاکستان کو بہت فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے انہوں نے سیاست میں آئیڈیالوجیکل طریق کار کو اپنایا اور آئیڈیالوجیکل نقطہ نظر اپنانے کی وجہ سے وہ پاکستان کی جمہوری جدوجہد سے لا تعلق رہے۔ بعد میں ان کا نصب العین فقط پاکستان میں نفاذ اسلام تک محدود ہو کر رہ گیا اور عملی سیاست میں جمہوری طریقہ کار کو اپنانے کی وجہ سے قومی سیاست کو دینی اور لا دینی پارٹیوں میں تقسیم کر کے نفاذ اسلام کے مسئلہ کو بھی ایک پارٹی ایشو بنا دیا۔ اور نفاذ اسلام کی اس جدوجہد میں نفاذ شریعت کا مسئلہ فقہی اختلافات کی نذر ہو گیا۔

مولانا مودودی کے انداز فکر کے مطابق مسلم لیگ بری تھی یا بھلی اور قائد اعظم محمد علی جناح ان کی محدود سوچ کے مطابق "سیکولر" تھے یا "دین سے ناواقف" یا "مغرب زدہ مسلم نیشنلسٹ" لیکن ان کا یہ کارنامہ ہماری تاریخ کا ایک شاندار حصہ ہے کہ انہوں نے لوگوں میں اسلام سے محبت بھی برقرار رکھی اور امت مسلمہ کے شعور وحدت کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ فروغ دیا۔ مگر پاکستان میں جماعت اسلامی نہ تو نفاذ اسلام کا مرحلہ طے کر پائی اور نہ ہی دنیا میں اسلام کے عالمی کردار کو نمایاں طور پر پیش کر سکی۔

پاکستان کو قائم ہوئے نصف صدی کا عرصہ بیت چکا ہے اور آج اس کا یہ حال ہے کہ نفاذ اسلام کی طرف پیش رفت کے برعکس فرقہ واریت زوروں پر ہے اور ملک میں دہشت گردی اور قتل و غارت کا بازار گرم ہے۔ مسجدیں تک محفوظ نہیں رہیں اور اسلام وحدت سازی کے اعتبار سے بے اثر ہوتا جا رہا ہے۔ نسل' ذات' برادری' زبان اور علاقائی تعصبات کی وجہ سے وحدت خیزی اور وحدت سازی کی قوت کمزور پڑ گئی۔ اگر وحدت خیز قوت کی حیثیت سے اسلام پاکستان میں ہی بے اثر ہو کر رہ جائے تو دنیا میں ایک عالمی تہذیبی تحریک برپا کرنے میں کیا کردار ادا کر سکتا ہے؟

ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی نسل کو غائت پاکستان سے آگاہ کیا اور انہیں بتایا

جائے کہ مشیت ایزدی پاکستان کو اس مقصد کے لیے معرض وجود میں لائی ہے کہ یہیں سے اسلام نے بنی نوع انسان کو متحد کرنے میں اپنا عالمی کردار ادا کرنا ہے۔ پاکستان کے موجودہ حالات حوصلہ شکن سہی اور شاید موجودہ حالات میں یہاں سے عالمی کردار کی بات بھی لوگوں کو بے معنی بلکہ مضحکہ خیز بات لگے لیکن ہمیں یقین ہے کہ اگر پاکستان میں آج بھی اس نصب العین کو اپنا لیا جائے تو ہمارے داخلی اور خارجی حالات رو بہ اصلاح ہو سکتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ایک بہت بڑا نصب العین سامنے رکھنے سے چھوٹے چھوٹے باعث نزاع امور پر سے توجہ خود بخود ہٹنے لگتی ہے۔ اختلافات کم ہونے لگتے ہیں اور ان پر قابو پانا آسان ہو جاتا ہے۔

ہمیں دنیا کو بحیثیت پاکستانی مسلمان یہ بتانا ہے کہ اسلام نفرت نہیں بلکہ سراپا محبت کا دین ہے۔ ایک خدا کی محبت ہمیں اس کی تمام مخلوق سے محبت کا درس دیتی ہے' اس لیے خدا کے تمام بندوں سے ہمیں پیار ہے۔ بحیثیت انسان ہم ہندو اور یہودی سے بھی محبت رکھتے ہیں لیکن ان سے ہمارا اختلاف اور نزاع ہمیشہ وہاں پیدا ہوتا ہے جب یہ اقوام نسلی تفوق میں یقین رکھنے کی بنا پر دنیا میں فتنہ و فساد کا باعث بنتی ہیں۔ اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں سے اعلیٰ اور برتر ہونے کے دعویٰ کی بنا پر انہوں نے دنیا کی کمزور اور فرومایہ اقوام کو ہمیشہ اپنی خدمت گزار اور باج گزار اقوام شمار کیا اور انہیں اپنے ظلم و جور کا نشانہ بنایا۔ مسلمانوں جیسی صلح جو' امن پسند اور انسانی مساوات میں یقین رکھنے والی قوم سے بھی ان کا یہی رویہ رہا ہے چنانچہ ہنود اور یہود کی مسلمانوں کے ساتھ دشمنی کی ایک پرانی تاریخ ہے۔ جب تک ان کا یہ انسانیت سوز رویہ ختم نہیں ہوتا ان کا اسلام دشمن رویہ بھی برقرار رہے گا اور مسلمان بھی انہیں دشمن انسانیت سمجھنے پر مجبور رہیں گے۔

ہندو قوم منکر توحید اور ایک مشرک قوم ہے اس لیے اس کی اصلاح نسبتاً مشکل ہے۔ لیکن الہامی مذاہب سے وابستہ قومیں جو خدا کو مانتی ہیں انہیں قرآن حکیم توحید کی بنا پر دعوت اتحاد دیتا ہے اور ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دیتا ہے کہ توحید کا وہی تصور اور نظریہ معتبر ہے جو قرآن کے مطابق ہو اور قرآن کے نظریہ توحید کے بارے میں دو باتیں بہت واضح ہیں یعنی خدا پر ایمان ہر طرح کے شرک سے پاک ہونا چاہیے کیونکہ شرک ہی فکر انسانی کی ساری گمراہیوں کا باعث ہے اور دوسرے یہ کہ اس توحید کا

لازمی نتیجہ وحدت آدم کی صورت میں نکلنا چاہیے۔ کیونکہ یہی امن و سلامتی کا راستہ ہے عیسائی خدا کو مانتے ہیں مگر شرک پر اصرار کرتے ہیں جس سے خدا کی محبت خالص نہیں رہتی اور فکر انسانی میں کجی اور گمراہی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہودیوں کا عقیدہ توحید شرک سے مبرا ہے لیکن اپنی نسلی برتری میں یقین رکھنے کی وجہ سے، خدا سے ان کا تعلق انسانی معاشرے کے لیے بالکل بے اثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں یہودی توحید پر ایمان کے باوجود آج تک وحدت آدم کے نصب العین کے حصول میں بہت بڑی رکاوٹ رہے ہیں اور جن قوموں سے بھی ان کا واسطہ پڑا ان کی طرف سے یہودیوں کے خلاف شدید نفرت کی گئی اور بسا اوقات اس نفرت کا اظہار قتل و غارت گری کی صورت میں ہوا۔

سائنسی ترقی کے موجودہ دور میں ذرائع آمد و رفت کی سہولتوں اور آسانیوں اور ذرائع ابلاغ کی برق رفتاری کی وجہ سے دنیا سمٹ رہی ہے۔ اور معاشی اور سیاسی وحدت کی طرف بڑھ رہی ہے جس میں طاقتور قومیں کمزور قوموں پر استحصالی گرفت مضبوط کر رہی ہیں۔ اور کمزور قوموں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے ہر قسم کی بربریت روا رکھی جا رہی ہے۔ رنگ، زبان، نسل اور وطن کے تعصبات کو ابھار کر ہر قسم کے ظلم و فساد کا جواز ڈھونڈا جا رہا ہے اور دور حاضر کے اس نام نہاد "مہذب" دنیا میں انسان کو انسان کی طرح رہنے کا سلیقہ نہیں آیا اور اسلام کی رہنمائی کا محتاج ہے۔

عشق نا پید و خرد می گزدش صورت مار
عقل کو تابع فرمان نظر نہ کر سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر نہ کر سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

اس ضرورت کو صرف اسلام ہی پورا کر سکتا ہے کیونکہ اسی کے پاس توحید کا وہ روحانی اصول موجود ہے جو ایک ملت آدم کا قیام عمل میں لا سکتا ہے۔

پس چہ باید کرد؟

عصر حاضر کی مادہ پرست تہذیب کا یہ عظیم الشان کارنامہ ہے کہ اس دور میں سائنسی ترقی کی بدولت دنیا سمٹ کر ایک عالمی گاؤں کی صورت اختیار کر گئی ہے اور ایک عالمی انسانی برادری کے قیام کے لئے سازگار مادی حالات فراہم ہو گئے ہیں۔ شاید قدرت کو اس تہذیب سے یہی کام لینا مقصود تھا جو مکمل ہو گیا۔ دنیا کو اب ایک ایسی تہذیب کی ضرورت ہے جو مادی تہذیب کے فراہم کردہ اس انفراسٹرکچر کو کام میں لا کر دنیا میں ملت آدم کا قیام عمل میں لائے تاکہ دنیا کے کے تمام انسان ایک عالمی برادری کی شکل میں امن و سلامتی کی زندگی گزار سکیں۔

موجودہ مادہ پرست تہذیب کی سیاسی اساس لادینی جمہوریت پر قائم ہے اور اس تہذیب کے پرستاروں کا یہ خیال ہے کہ تاریخ اپنا سفر مکمل کر کے لادینی جمہوریت کی منزل پر پہنچ کر رک گئی ہے اور تمام اقوام عالم جلد یا بدیر اس جمہوریت کے زیر سایہ پناہ لینے پر مجبور ہو جائیں گی۔

لیکن یہ لادینی جمہوری تہذیب اس شیطان پر قابو پانے سے یکسر قاصر ہے جو انسان کے اندر موجود ہے چنانچہ تہذیب حاضر کا پروردہ خودپرست انسان رنگ' نسل' زبان اور وطن کے امتیازات کو مٹانے کی صلاحیت نہیں رکھتا' اس لئے نسلی' وطنی اور مقامی تعصبات نے اس دنیا کو اقتصادی لوٹ کھسوٹ کا اکھاڑہ اور جنگ وجدل کا میدان بنا رکھا ہے۔ اور دنیا ایک بہت بڑے استحصالی نظام کی گرفت میں ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک بنی نوع انسان کی اگلی تہذیب "روحانی جمہوریت" کی تہذیب ہو گی جو توحید کی روحانی اساس پر دنیا میں ایک ملت آدم قائم کرے گی اور یہی اسلام کا مقصود ہے۔ علامہ اقبال اسلام کی وحدت خیز قوت میں یقین رکھتے تھے اور شمال مغربی ہندوستان میں اسلام کی تہذیبی قوتوں کو مجتمع کر کے ایک جدید اسلامی ریاست قائم کرنا چاہتے تھے جو دنیا کے لئے ایک نمونہ کا کام دے۔ ان کے نزدیک یہ ریاست "روحانی جمہوریت" کے لئے ایک عالمی تہذیبی تحریک چلانے کا نقطہ آغاز ہے اور ان کے تصورات اور نظریات کی رو سے یہی غائت پاکستان ہے۔ نئی عالمی تہذیب پیدا کرنے میں ہماری کامیابی کا انحصار نظریہ توحید کی بین الاقوامی فعالیت پر ہے

گذشتہ پچاس سال کے دوران اہل پاکستان نے بین الاقوامی فعالیت سے تغافل

برتا ہے۔ ہمیں اچھی طرح سے جان لینا چاہیے کہ جب تک ہم دنیا کو یہ بتانے کے قابل نہیں ہوتے کہ اسے ہماری ضرورت ہے اور عالمی سیاست میں ہمارا ایک اہم کردار ہے اس وقت تک ہم دنیا کے سامنے قیام پاکستان کا کوئی معقول جواز نہیں پیش کر سکتے اور نہ ہی اس انتشار کو دور کر سکتے ہیں جو آج ہماری اپنی صفوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ عصر حاضر میں کوئی ملک اپنی داخلی مشکلات پر بھی اس وقت تک قابو نہیں پا سکتا جب تک کہ وہ اپنی بین الاقوامی فعالیت کو زیادہ موثر نہ بنائے۔

پاکستان کی نوجوان نسل کو یہ بتلانے کی اشد ضرورت ہے کہ پاکستان ہندو کے خوف یا ہندو کی نفرت کے نتیجے میں معرض وجود میں نہیں آیا بلکہ توحید کے روحانی اصول کی بنیاد پر ایک نئی تہذیب اور نئے عالمی نظام کی تشکیل کے لئے قائم ہوا ہے۔ قدرت نے پاکستان کو ایک نہایت ہی اہم اور مثبت کردار سونپا ہے اور ہمارا منتہائے مقصود ایک عالمی برادری کا قیام ہے۔ یہ کام ہمارے ہاتھوں انجام پانا ہے کیونکہ ہم اس دنیا میں خدا کا آخری پیغام ہیں۔

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

"پاکستان کا قیام درحقیقت کفر کی طاقتوں کے خلاف اسلام کا رد عمل ہے اور اسلام کا وہی رد عمل جس نے ایک طرف فلسفہ خودی کو پیدا کیا ہے اسی نے دوسری طرف ایک ریاست کو بھی پیدا کیا ہے جسے فلسفہ خودی اپنے مقصد کے لئے کام میں لا سکتا ہے۔ پاکستان کا تصور بھی اسی "اقبال" کی ایجاد ہے جو فلسفہ خودی کا موجد تھا۔ دونوں کے ظہور کے وقت کا ٹھیک تطابق اتفاقی نہیں بلکہ اس کے تحت قدرت کی یہ خواہش کام کر رہی ہے کہ کامل نظام افکار کو (عملی شکل دے کر) اور اس کی معرفت تمام دنیا کے باطل فلسفوں سے نجات دلا کر دنیا کے ارتقاء کا راستہ ہموار کیا جائے"۔ ــــــ ڈاکٹر رفیع الدین

حرف آخر

افکار اقبال کے حوالے سے غائت پاکستان کو سمجھنے کے لئے ان کے دو خطبات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ خطبہ الہ آباد جو آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو الہ آباد میں دیا اور خطبہ لاہور جو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو لاہور میں دیا گیا۔ ان دو خطبات میں علامہ اقبال کا سیاسی فکر مجملاً" سمٹ آیا ہے جس کو آگے چل کر مسلم لیگ نے مطالبہ پاکستان کی شکل دی اور قائداعظم کی شاندار قیادت میں کرہ ارض پر پاکستان کے نام سے ایک نیا ملک ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو معرض وجود میں آگیا۔

خطبہ الہ آباد کی حیثیت بنیادی ہے۔ اس خطبہ میں آپ نے پنجاب' صوبہ سرحد' سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ایک ریاست قائم کرنے کی تجویز پیش کرتے ہوئے وجدانی شہادت دی کہ مسلمانوں کو بالآخر یہ منظم اسلامی ریاست قائم کرنی پڑے گی اور اس ریاست کی غائت یہ بیان کی کہ اسلام کو بطور ایک تمدنی قوت ابھرنے کے لئے اس مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ پھر اسلام کی تمدنی قوت کی وضاحت کرنے کے لئے خطبہ کے ابتدائی حصے میں اسلام کی آفاقیت' وحدت خیز قوت اور عالمگیر مطمح نظر پر بے حد زور دیا۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی سے روایت ہے کہ انہوں نے خطبہ الہ آباد کو اپنے کالج کے طلباء کو ایک نصاب کی حیثیت دے کر پڑھانا شروع کیا تو علامہ اقبال بہت خوش ہوئے اور پروفیسر صاحب سے تاکیداً فرمایا کہ اس خطبے کا پہلا حصہ بہت اہم ہے اور اسے خاص طور پر محنت سے پڑھایا جائے کیونکہ اس میں نوجوانوں کی سیاسی سوچ کے لئے صحیح خطوط متعین کر دیے گئے ہیں تیز اس خطبے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا کہ علامہ اقبال نے اس کے سوا سال بعد خطبہ لاہور میں واضح الفاظ میں فرمایا کہ "میرے پاس کوئی نئی چیز پیش کرنے کے لئے نہیں ہے اس سلسلے میں آل انڈیا مسلم لیگ کے خطبے میں میں اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں" اور یہ بھی کہا کہ "خوش قسمتی سے زیر بحث مسائل اس قدر واضح ہو چکے ہیں کہ اب معاملہ کا انحصار کسی فرد کی رہنمائی پر نہیں بلکہ تمام لوگوں کے انفرادی عزائم کے ایک خاص مقصد پر مرتکز ہو جانے پر ہے۔

خطبہ لاہور کے مباحث اگرچہ بنیادی طور پر ہندی مسلمانوں کے لائحہ عمل سے متعلق ہیں لیکن اس خطبے میں علامہ اقبال نے چند ایسی پیش گوئیاں کی ہیں جو دور حاضر سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً ہندوستان کی سیاسی بے چینی اور اضطراب پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے واضح الفاظ میں کہا:

"یہ مظاہر ایک آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہیں جو تمام ہندوستان اور ایشیا پر چھا جائے گا۔ یہ ایک کلیتاً" سیاسی تہذیب کا لازمی نتیجہ ہے جو انسان کو ایک چیز (Thing) سمجھتی ہے جس سے کام لیا جائے نہ کہ ایک شخصیت (Personality) جسے تہذیبی قوتوں سے نشوونما دی جائے۔ ایشیائی قومیں لازماً اس استحصالی اقتصادیات کے خلاف اٹھیں گی جسے مغرب نے نشوونما دی ہے اور مشرقی اقوام پر مسلط کیا ہے۔"

کس قدر حیران کن بات ہے کہ جس تہذیبی تصادم (Clash of civilizations) اور "اسلام کی خونیں سرحدوں" (Islam's bloody borders) کی بات ہنٹنگٹن (Huntington) آج کر رہا ہے علامہ اقبال پینسٹھ سال پہلے ہی اس کی خبر دے رہے تھے۔ نیز مسلمانوں کو مغرب کے آئیڈیالوجیکل (ideological) سیاسی طریق کار کے برعکس اسلام کے کلچرل طریق کار کو اپنانے کا مشورہ دے رہے تھے اور انسانی شخصیت کی تربیت پر انحصار کرتے ہوئے انہیں نئے عالمی نظام کی تشکیل یعنی نئی دنیا پیدا کرنے کی دعوت دے رہے تھے۔ علامہ اقبال نے فرمایا۔

"جس مذہب کی آپ نمائندگی کرتے ہیں وہ فرد کی اہمیت تسلیم کرتا ہے اور اس کی تربیت کرتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ خدا اور انسان کی خدمت میں نثار کر دے۔ اس کے امکانات ابھی ختم نہیں ہوئے' وہ اب بھی ایک نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے۔"

اس زمانے میں نئی دنیا پیدا کرنے کے لئے اسلام نے کوئی فعال کردار ادا کرنا ہے تو اس کے لئے علامہ اقبال ضروری قرار دیتے ہیں کہ روحانی طور پر ہم تخیلات و جذبات کے جس جال میں صدیوں سے مقید ہیں اور جو ہمارے ملاؤں اور فقیہان بے توفیق نے ہمارے گرد بن رکھا ہے اس سے رہائی حاصل کریں اور اپنی نئی نسلوں کو ان اقتصادی' سیاسی اور مذہبی بحرانوں سے نکلنے کی راہ دکھائیں جو انہیں دور حاضر میں درپیش ہیں۔ لیکن یہی وہ کام ہے جس سے ہم نے گزشتہ پچاس سال تک مجرمانہ غفلت برتی اور اسی غفلت کا نتیجہ ہے کہ ہر طرح کے بحرانوں نے پاکستان کو آج ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ اور آج کی نئی نسل یہ سمجھنے سے بھی قاصر ہے کہ پاکستان کس مقصد کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔

ہمیں اس کی وجہ صرف یہ نظر آتی ہے کہ قیام پاکستان کے بعد بالعموم فکر اقبال کو بھلا دیا گیا' یہ سمجھ لیا گیا کہ قیام پاکستان سے علامہ اقبال کا سیاسی مشن پورا ہو گیا ہے اور ان کے سیاسی

افکار کی اب کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ البتہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین تنہا ایسی شخصیت ہیں جنھوں نے پاکستان کے لئے علامہ اقبال کے سیاسی افکار کی اہمیت کو واضح کرنے کی مقدور بھر کوشش کی۔ قیام پاکستان کے چند ہی سال بعد آپ نے "پاکستان کا مستقبل" کے حوالے سے ایک کتاب لکھی جس میں پرزور مطالبہ کیا گیا کہ فلسفہ خودی کو پاکستان کا سرکاری نظریہ قرار دیا جائے اور اس کی تشریح یوں کی کہ "اسلام کو ریاست کا سرکاری نظریہ قرار دے کر فلسفہ خودی کو اس کی سرکاری ترجمانی کے لئے کام میں لایا جائے۔" اور اپنے اس پختہ یقین کا اظہار کیا کہ اگر ایسا ہو گیا تو پاکستان دنیا کے کناروں تک پھیل جائے گا۔" آپ نے پوری تحدی سے یہ بھی دعویٰ کیا کہ "ہمارے پاس کوئی دوسرا فلسفہ ایسا نہیں ہے جو اپنے اندرونی استدلال کو وسعت دے کر ایک جدید انسانی اور اجتماعی فلسفہ بن سکے اور آئندہ عالمگیر ریاست کو اپنے سیاسی یا اقتصادی یا اخلاقی یا تعلیمی یا قانونی یا معاشرتی یا اطلاعاتی نظام کے لئے قابل فہم تصورات بہم پہنچا سکے۔" اور آخر میں پرزور تاکید کے انداز میں فرمایا کہ "یہ نکتہ نہایت ہی اہم ہے اور جس پر ہم حاوی ہو جائیں اتنا ہی ہمارے لئے اچھا ہو گا"

لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین سرتاپا ایک علمی شخصیت تھے اور سیاسی اثر اور رسوخ کے اعتبار سے پاکستان میں ان کی کوئی آواز نہ تھی۔ جس زمانے میں وہ یہ باتیں کر رہے تھے اس وقت تک تو ان کے علمی مرتبہ اور مقام سے بھی بہت ہی کم لوگ واقف تھے۔ بلکہ ان کی زندگی میں انہیں وہ مرتبہ اور مقام بھی نہیں دیا گیا جس کے وہ جائز طور پر مستحق تھے اور ان کی موت کے ربع صدی بعد کہیں جا کر علمی دنیا نے ان کی علمی حیثیت کو تسلیم کرنا شروع کیا ہے۔ مگر یہ فقط ڈاکٹر رفیع الدین ہی کی نہیں پاکستان کی بھی بدقسمتی تھی کہ ان کی آواز کو کسی نے در خور اعتنا نہیں سمجھا۔ یہ امر بھی خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ پاکستان کی پوری فکری تاریخ میں فقط وہی ایسے دانشور ہیں جنھوں نے پاکستان کے عالمی کردار کی بات کی اور اس ضمن میں علامہ اقبال کے فکر کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ قیام پاکستان کے پچاس سال بعد اگر آج بھی اس نکتہ کو سمجھ لیا جائے کہ اسلام کا ایک عالمگیر نصب العین ہے' آج کی دنیا میں اسلام نے ایک عالمگیر کردار کرنا ہے اور پوری امت مسلمہ میں اس شعور کو عام کرنے اور اس کے لئے عملی جدوجہد کرنے کے لئے ہی پاکستان معرض وجود میں آیا ہے تو کل سے ہی ہماری ناکامیاں کامیابیوں میں تبدیل ہونا شروع ہو جائیں گی۔

ہمیں احساس ہے کہ اس کتابچے کے قارئین کو ہماری تحریر میں تکرار کا عیب نظر آیا ہو گا لیکن ہم اس بات کو بار بار دہرانے سے کبھی نہیں تھکیں گے کہ خطبہ الہ آباد میں علامہ اقبال نے

پاکستان کی ضرورت بیان کرتے وقت اسلام کی وحدت خیز قوت پر بے حد زور دیا تھا لہٰذا غایت پاکستان یہ ہے کہ دنیا میں اسلام کی وحدت خیز قوت کے ٹھوس عملی نتائج پیدا ہوں اور آج کے سیاسی منظر نامہ میں کرہ ارض پر ملت آدم قائم کرنے کے لئے پاکستان اپنا عالمی کردار ادا کرتا نظر آئے تاکہ پوری دنیا یہ محسوس کرنے لگے کہ قدرت پاکستان کو دنیائے انسانیت کی کسی حقیقی ضرورت پورا کرنے کے لئے معرض وجود میں لائی ہے۔ **ہمیں چاہیے کہ پاکستانیوں کو انماالمومنون اخوۃ کا سبق ازبر کرائیں' امت مسلمہ کو 'امت واحدہ' کا بھولا ہوا سبق یاد دلائیں اور اس کے ساتھ ساتھ رب العالمین کی ہدایت اور رحمتہ للعالمین کی دعوت کے مطابق اس کرہ ارض کو امن کی بستی بنانے کی بھرپور جدوجہد کریں۔**

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

یہی غایت پاکستان ہے اور یہی پاکستان کا مقدر —— یعنی تعمیر جہان نو اور نیا عالمی نظام۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال کے پیغام کی توضیح و تشریح کے سلسلے میں ہم اپنی ذمہ داریوں سے کماحقہ عہدہ برا نہیں ہو پائے اور ایک شارح اسلام اور ترجمان قرآن کی حیثیت سے ان پر زیادہ کام نہیں ہوا۔ علامہ اقبال دور جدید کے انسان کے ذہنی تقاضوں کے مطابق تفہیم قرآن کی ایک منہاج متعین کرنا چاہتے تھے جس کے لیے انہوں نے میاں محمد شفیع مرحوم کو اس کا خاکہ املا کروایا (یہ خاکہ بی۔ اے۔ ڈار کی کتاب (Letters & Writings of Iqbal) میں شامل ہے) لیکن ان کی وفات کے بعد ان کا یہ منصوبہ تشنہ تکمیل رہا تاہم اس خاکہ کی بنیاد پر علامہ اقبال کے افکار و اشعار کی روشنی میں آج بھی اس منصوبے کو مکمل کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح دور حاضر کی سیاسیات میں اسلام کے عالمی کردار کے بارے میں خطبہ الہ آباد کے آغاز میں جو بحث اٹھائی ہے اس کی توضیح اور تشریح کے سلسلے میں تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔ علامہ اقبال نے خطبات میں روحانی جمہوریت' کا ذکر کیا ہے اور یہ موضوع ہماری قومی زندگی کے لیے بے حد اہمیت کا حامل ہے لہٰذا آخر میں یہ درخواست بے جا نہ ہو گی کہ علامہ اقبال پر تحقیقات کے لیے وقف شدہ قومی ادارے ایسے موضوعات پر زیادہ سے زیادہ توجہ دیں اور خود حکومت بھی ان کاموں کی اہمیت تسلیم کرے تاکہ نئی نسلیں علامہ اقبال کے افکار سے رہنمائی حاصل کر سکیں۔

کتابیات

اس کتابچہ میں درج شدہ تمام اشعار **کلیات اقبال (فارسی اور اردو)** سے نقل کئے گئے ہیں' البتہ ایک شعر جو صفحہ ۴۵ پر درج ہے **"روز گار فقیر** مولفہ فقیر سید وحیدالدین جلد دوم (ص ۲۳۷) مطبوعہ لائن آرٹ پریس (کراچی) لیمٹڈ سے نقل کیا گیا ہے۔

۱۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین' **پاکستان کا مستقبل**' آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس' ۷ فرینڈز کالونی' ملتان روڈ لاہور ۱۹۹۴ء

۲۔ ایضاً

3- Annemarie Schimmil, **Gabriel's wing**, Iqbal Academy Pakistan, Lahore (1989)

4- Javid Iqbal, **Stray Reflections**, Shaikh ghlulam Ali & Sons Lahore (1961)

۵۔ بشیر احمد ڈار' **انوار اقبال**' اقبال اکیڈمی پاکستان' کراچی (۱۹۶۷ء)

۶۔ ایضاً

۷۔ ایضاً

۸۔ محمد رفیق افضل' **گفتار اقبال**' ادارہ تحقیقات پاکستان' دانش گاہ پنجاب' لاہور (۱۹۶۹ء)

9- As at no.4 above.

10- As at no.4 above.

۱۱۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین ہاشمی' **تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ**' اقبال اکیڈمی پاکستان لاہور (۱۹۸۲)

۱۲۔ بحوالہ نمبر ۸ مندرجہ بالا

13- Syed Abdul Vahid, **Thoughts and Reflections of Iqbal**, Shaikh Muhammad Ashraf, Kashmiri Bazar, Lahore (1964)

14- Ibid

15- Ibid

16- Ibid

۱۷۔ اقبال' **پیام مشرق** (دیباچہ) شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور (۱۹۳۲ء)

۱۸- ایضاً

۱۹- ایضاً

20- Prof. Mirza Muhammad Monnawer Allam Iqbal on Quranic Status, The News Lahore (November 9, 1993).

۲۱- سید عبدالواحد معینی، **مقالات اقبال**، شیخ محمد اشرف، کشمیری بازار، لاہور

۲۲- شیخ عطاء اللہ، **اقبالنامہ جلد اول**، شیخ محمد اشرف، کشمیری بازار، لاہور

۲۳- ایم سعید صدیقی، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، ۶ اپریل ۱۹۹۶ء

24- As at 3 above

25- As at 3 above

۲۶- بحوالہ نمبر ۸ مندرجہ بالا

۲۷- بحوالہ نمبر ۸ مندرجہ بالا

۲۸- فقیر سید وحید الدین، **روز گار فقیر حصہ اول**، لائن آرٹ پریس (کراچی) لمیٹڈ (۱۹۶۶ء)

۲۹- بحوالہ نمبر ۸ مندرجہ بالا

۳۰- ڈکٹر سید محمد اکرم، **اقبال ستارہ بلند شرق**: تقریر آیت اللہ سید علی خامنہ ای، اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور (۱۹۹۶ء)

31- As at 3 above

۳۲- بحوالہ نمبر ۳۰ مندرجہ بالا

33- As at 4 above.

34- M.A. Jinnah, Letters of Iqbal to Jinnah, Shaik Muhammad Ashraf, Kashmire Bazar, Lahore.

35- Ibid

36- Waheeduzzaman Qaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah Myth & Reality, National Institute of Historical & cultural Research, Islamabad.

37- Mazharuddin Siddiqi, The Image of the West in Iqbal, Institute of Islamic Culture, Lahore (1965)

۳۸- شاملو، **حرف اقبال**، المنار اکیڈمی، ریلوے روڈ لاہور (۱۹۴۵ء)

۳۹- ایضاً

40- As at no.13 above.

41- As at no 13 above.

42- Ali A. Mazrui, Islam & End of History, The American Journal of Islamic Social Science (Vol 10. no 4) International Institute of Islamic Thought, Islamabad.

۴۳- اخلاق حسین قاسمی، مولانا ابوالکلام اور جہاد فی سبیل اللہ **ندائے خلافت** (جلد ۵: شمارہ ۴۱ ۴۳ ۴۴) ۲ دسمبر ۱۹۹۶ء

44- Shamloo, Speeches and statments of Iqbal, Almanar Academy Lahore (1948)

۴۵- بحوالہ نمبر ۳۸ مندرجہ بالا

۴۶- مجیب الرحمٰن شامی صدر ترکیہ سلیمان ڈیمرل سے انٹرویو **ہفت روزہ زندگی** ۳۰ مارچ تا ۵ اپریل ۱۹۹۷ء) لاہور

47- As at no 13 above.

48- As at no 4 above.

ضمیمہ

علامہ اقبال کا خطبہ الہ آباد

(با جلاس آل آنڈیا مسلم لیگ دسمبر ۱۹۳۰ء)

حضرات!

میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے ایک ایسے وقت میں مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کا اعزاز بخشا ہے جب کہ مسلمانان ہندوستان کی سیاسی زندگی نے ایک نہایت ہی نازک صورت اختیار کر لی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس عظیم الشان اجتماع میں ان حضرات کی کمی نہیں جن کا تجربہ مجھ سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور جن کی معاملات فہمی کا میں دل سے قائل ہوں۔ لہٰذا یہ بڑی جسارت ہو گی اگر میں ان مسائل میں جن کے فیصلے کے لیے آج یہ حضرات یہاں جمع ہوئے ہیں ان کی رہنمائی کا دعویٰ کروں۔ میں کسی جماعت کا رہنما نہیں نہ کسی رہنما کا پیرو ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کا زائد حصہ اسلام اور اسلامی فقہ و سیاست' تہذیب و تمدن اور ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس مسلسل اور متواتر تعلق کی بدولت جو مجھے تعلیمات اسلامی کی روح سے جیسا کہ مختلف زمانوں میں اس کا اظہار ہوا ہے رہا ہے میں نے اس امر کے متعلق ایک خاص بصیرت پیدا کر لی ہے کہ ایک عالمگیر حقیقت کے اعتبار سے اسلام کی حیثیت کیا ہے۔ لہٰذا یہ فرض کرتے ہوئے کہ مسلمانان ہندوستان بہرحال اپنی اسلامی روح کو برقرار رکھنے پر مصر ہیں میں کوشش کروں گا کہ آپ کے فیصلوں کی رہنمائی کی بجائے اسی بصیرت کی روشنی میں خواہ اس کی قدر و قیمت کچھ بھی ہو آپ کے دل میں اس بنیادی اصول کا احساس پیدا کر دوں جس پر میری رائے میں ہمارے تمام فیصلوں کا عام انحصار ہونا چاہیے۔

اسلام اور قومیت

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بحیثیت ایک اخلاقی نصب العین اور نظام سیاست کے (اس آخری لفظ سے میرا مطلب ایک ایسی جماعت ہے جس کا نظم و انضباط کسی نظام قانون کے ماتحت عمل میں آتا ہو لیکن جس کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح سرگرم کار ہو) اسلام ہی وہ سب سے بڑا جزو ترکیبی تھا جس سے مسلمانان ہند کی تاریخ حیات متاثر ہوئی۔ اسلام ہی کی بدولت مسلمانوں کے سینے ان جذبات و عواطف سے معمور ہوئے جن پر جماعتوں کی زندگی کا دار و مدار ہے اور جن سے متفرق و منتشر افراد بتدریج متحد ہو کر ایک متمیز و معین قوم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ان کے اندر ایک

مخصوص اخلاقی شعور پیدا ہو جاتا ہے- حقیقت میں یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ دنیا بھر میں شاید ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں اسلام کی وحدت خیز قوت کا بہترین اظہار ہوا ہے- دوسرے ممالک طرح ہندوستان میں بھی جماعت اسلامی کی ترکیب صرف اسلام ہی کی رہین منت ہے کیونکہ اسلامی تمدن کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح کار فرما ہے- میرا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا اندرونی اتحاد اور ان کی نمایاں یکسانیت ان قوانین و ادارات کی شرمندۂ احسان ہے جو تہذیب اسلامی سے وابستہ ہیں- لیکن اس وقت مغرب کے سیاسی افکار نے نہایت تیزی کے ساتھ نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر تمام دنیائے اسلام میں ایک انقلاب پیدا کر رکھا ہے- نوجوان مسلمانوں کی یہ خواہش ہے کہ وہ ان افکار کو عملاً اپنی زندگی کا جز بنا لیں- انہوں نے اس امر پر مطلق غور نہیں کیا کہ وہ کون سے اسباب تھے جن کے ماتحت ان افکار نے مغرب میں نشوونما پایا- یاد رکھنا چاہیے کہ سرزمین مغرب میں مسیحیت کا وجود محض ایک رہبانی نظام کی حیثیت رکھتا تھا- رفتہ رفتہ اس کلیسا کی ایک وسیع حکومت قائم ہوئی- لوتھر کا احتجاج دراصل اسی کلیسیائی حکومت کے خلاف تھا- اس کو کسی دنیوی نظام سیاست سے کوئی بحث نہیں تھی کیونکہ اس قسم کا کوئی نظام سیاست مسیحیت میں موجود نہیں تھا- غور سے دیکھا جائے تو لوتھر کی بغاوت ہر طرح سے حق بجانب تھی اگرچہ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ خود لوتھر کو بھی اس امر کا احساس نہ تھا کہ جن مخصوص حالات کے ماتحت اس کی تحریک کا آغاز ہوا ہے اس کا نتیجہ بالآخر یہ ہو گا کہ مسیح کے عالمگیر نظام اخلاق کی بجائے مغرب میں ہر طرف بے شمار ایسے اخلاقی نظام پیدا ہو جائیں گے جو خاص خاص قوموں سے متعلق ہوں گے اور لہٰذا ان کا حلقہ اثر بالکل محدود رہ جائے گا- یہی وجہ ہے کہ جس ذہنی تحریک کا آغاز لوتھر اور روسو کی ذات سے ہوا اس نے مسیحی دنیا کی وحدت کو توڑ کر اسے ایک ایسی غیر مربوط اور منتشر کثرت میں تقسیم کر دیا جس سے اہل مغرب کی نگاہیں اس عالمگیر مطمح نظر سے ہٹ کر جو تمام نوعِ انسانی سے متعلق تھا اقوام و ملل کی تنگ حدود میں الجھ گئیں- اس نئے تخیل حیات کے لیے انہیں ایک کہیں زیادہ واقعی اور مرئی اساس مثلاً تصور وطنیت کی ضرورت محسوس ہوئی جس کا اظہار بالآخر ان سیاسی نظامات کی شکل میں ہوا جنہوں نے جذبہ قومیت کے ماتحت پرورش پائی- یعنی جن کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ سیاسی اتحاد و اتفاق کا وجود عقیدۂ وطنیت ہی کے ماتحت ممکن ہے- ظاہر ہے کہ اگر مذہب کا تصور یہی ہے کہ اس کا تعلق صرف آخرت سے ہے- انسان کی دنیوی زندگی سے اسے کوئی سروکار نہیں تو جو انقلاب مسیحی دنیا میں رونما ہوا ہے وہ ایک طبعی امر تھا- مسیح علیہ السلام کا عالمگیر نظام اخلاق نیست و نابود ہو چکا ہے اور اس کی جگہ اخلاقیات و سیاسیات کے قومی نظامات نے لے لی ہے- اس سے اہل مغرب بجا طور پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مذہب کا معاملہ ہر فرد کی اپنی ذات تک محدود ہے- اسے دنیوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں- لیکن اسلام کے نزدیک ذات انسانی بجائے خود ایک وحدت ہے- وہ مادے اور روح کی کسی ناقابل اتحاد ثنویت کا قائل نہیں- مذہب اسلام کی رو سے خدا اور کائنات' کلیسا اور ریاست اور روح اور مادہ ایک ہی کل کے مختلف جزا ہیں- انسان کسی ناپاک دنیا کا باشندہ نہیں جس کو اسے ایک روحانی دنیا کی خاطر جو کسی دوسری جگہ

واقعہ ہے ترک کر دینا چاہیے۔ اسلام کے نزدیک مادہ روح کی اس شکل کا نام ہے جس کا اظہار قید مکانی و زمانی میں ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مغرب نے مادے اور روح کی ثنویت کا عقیدہ بلا کسی غور و فکر کے مانویت کے زیر اثر قبول کر لیا تھا۔ اگرچہ آج اس کے بہترین ارباب فکر اپنی اس ابتدائی غلطی کو محسوس کر رہے ہیں مگر سیاست دانوں کا طبقہ ایک طرح سے اب بھی مصر ہے کہ دنیا اس اصول کو ایک ناقابل انکار حقیقت کے طور پر تسلیم کر لے۔ دراصل یہ روحانی اور دنیوی زندگی کا غلط امتیاز ہے جس سے مغرب کے سیاسی اور مذہبی افکار بیشتر طور پر متاثر ہوئے ہیں اور جس سے یورپ کی مسیحی ریاستوں نے عملاً مذہب سے کلیتہً علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ اس سے چند متفرق اور بے ربط سلطنتیں قائم ہو گئی ہیں جن پر کسی انسانی جذبے کی بجائے قومی اغراض کی حکمرانی ہے۔ مگر لطف یہ ہے کہ آج یہی سلطنتیں ہیں جو مسیحیت کے اخلاقی اور مذہبی عقائد کی پامالی کے بعد ایک متحد یورپ کا خواب دیکھ رہی ہیں۔ بالفاظ دیگر ان کو ایک ایسے اتحاد کی ضرورت کا احساس ہو چلا ہے جو کلیسا کے ماتحت انہیں حاصل تو تھا لیکن جس کو اخوت انسانی کے اس عالمگیر تصور کی روشنی میں تعمیر کرنے کی بجائے جو مسیح علیہ اسلام کے دل میں موجود تھا انہوں نے لوتھر کی تعلیمات کے زیر اثر تباہ و برباد کر دیا۔ بہر حال دنیائے اسلامی میں کسی لوتھر کا ظہور ممکن نہیں اس لیے کہ اسلام میں کلیسا کا کوئی ایسا نظام موجود نہیں جو ازمنہ متوسط کے مسیحی نظام سے مشابہ ہو اور لہٰذا جس کے توڑنے کی ضرورت پیش آئے۔ دنیائے اسلام کے پیش نظر ایک ایسا عالمگیر نظام سیاست ہے جس کی اساس وحی و تنزیل پر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ چونکہ ہمارے فقہا کو ایک عرصہ دراز سے عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رہا اور وہ عہد جدید کی داعیات سے بالکل بیگانہ ہیں لہٰذا اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم اس میں از سر نو قوت پیدا کرنے کے لیے اس کی ترکیب و تعمیر کی طرف متوجہ ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ بالآخر تصور قومیت کا انجام ملت اسلامیہ میں کیسا ہو گا۔ آیا اسلام اس تصور کو اپنے اندر جذب کر کے اس کو اسی طرح بدل دے گا جس طرح اس سے پیشتر اس نے اس بالکل مختلف تصورات کی ترکیب و نوعیت کو ہمہ تن بدل دیا تھا" یا یہ کہ اس سے خود اسلام کے اندر کوئی زبردست تغیر رونما ہو جائے گا۔ کچھ روز ہوئے پروفیسر ونسنگ (Wensing) نے مجھے لیڈن (ہالینڈ) سے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ اسلام نے اس وقت اس نازک دور میں قدم رکھا ہے جس میں داخل ہوئے مسیحیت کو ایک صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے۔ اس وقت سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ بہت سے قدیم تصورات کو ترک کر دینے کے باوجود مذہب کی بنیادوں کو تزلزل و انتشار سے محفوظ رکھنے کی صورت کیا ہے۔ پروفیسر موصوف کہتے ہیں کہ ابھی تو وہ اسی امر کا فیصلہ نہیں کر سکے کہ اس کا نتیجہ مسیحیت کے حق میں کیا ہوگا۔ اسلام کے متعلق کوئی پیشگوئی کرنا اور بھی ناممکن ہے۔ اس وقت قوم و وطن کے تصور نے مسلمانوں کی نگاہوں کو نسل و خون کے امتیاز میں الجھا رکھا ہے اور اسلام کے انسانیت پرور مقاصد میں عملاً حارج ہو رہا ہے ممکن ہے کہ یہ نسلی احساسات ترقی کرتے کرتے ان اصول و قواعد کے محرک ہوں جو تعلیمات اسلامی کے مخالف ہی نہیں بلکہ ان سے بالکل متضاد ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات اس خالص علمی بحث کے

لئے مجھے معاف فرمائیں گے۔ لیکن آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لیے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو اس امر سے مایوس نہیں ہو گیا ہے کہ اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو ذہن انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کر سکتی ہے۔ جس کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور جسے یقین ہے کہ اسلام کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے۔ اسے کسی دوسری تقدیر کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ جس معاملے پر بھی غور کرے اپنے نقطۂ نظر کے ماتحت کرے۔ آپ یہ خیال نہ فرمایئے گا کہ جس مسئلے کی طرف میں نے اشارا کیا ہے وہ محض نظری حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک زندہ اور عملی سوال ہے جس سے بطور ایک دستور حیات اور نظام عمل کے اسلام کی ساری کائنات متاثر ہو سکتی ہے۔ صرف یہی ایک مسئلہ ہے جس کے صحیح حل پر اس امر کا دار و مدار ہے کہ ہم لوگ آگے چل کر ہندوستان میں ایک ممتاز و متمیز تہذیب کے حامل بن سکیں۔ اسلام پر ابتلا و آزمائش کا کبھی ایسا سخت وقت نہیں آیا جیسا کہ آج درپیش ہے۔ ہر قوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے بنیادی اصولوں کی ترمیم و تاویل کرے یا ان کو یک قلم منسوخ کر دے لیکن اس قسم کا قدم اٹھانے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ اس کے نتائج و عواقب کیا ہوں گے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ جس انداز سے میں نے اس مسئلے پر نظر ڈالی ہے اس سے کسی شخص کو یہ غلط فہمی ہو کہ جن حضرات کو میرے خیالات سے اتفاق نہیں ہے میں ان سے پیکار و مناقشت کا دروازہ کھولنا چاہتا ہوں۔ یہ اجتماع مسلمانوں کا ہے جن کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے مقاصد اور اس کی تعلیمات پر قائم رہنے کے دل سے آرزو مند ہیں۔ میرا مقصود صرف اس قدر ہے کہ موجودہ حالات کے متعلق میں نے جو رائے قائم کی ہے اس کا آزادی سے اظہار کر دوں۔ میرے نزدیک صرف یہی ایک صورت ہے اس امر کی کہ میں آپ کی سیاسی راہوں کو اپنے عقائد کی روشنی میں منور کر سکوں۔

قومیت ہند کا اتحاد

سوال یہ ہے کہ آج جو مسئلہ ہمارے پیش نظر ہے اس کی صحیح حیثیت کیا ہے؟ کیا واقعی مذہب ایک نجی معاملہ ہے اور آپ بھی یہ چاہتے ہیں کہ ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں لیکن اس کے نظام سیاست کی بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان نہیں رہتا؟ ہندوستان میں یہ سوال اور بھی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ باعتبار آبادی ہم لوگ اقلیت میں ہیں۔ یہ دعویٰ کہ مذہبی واردات محض انفرادی اور ذاتی واردات ہیں اہل مغرب کی زبان سے تو تعجب خیز معلوم نہیں ہوتا کیونکہ یوروپ کے نزدیک مسیحیت کا تصور ہی یہی تھا کہ وہ ایک مشرب رہبانیت ہے جس نے دنیائے مادیات سے منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ عالم روحانیت پر جما لی ہے۔ اس قسم کے عقیدے سے لازماً وہی نتیجہ مترتب ہو سکتا تھا جس کی طرف

اوپر اشارا کیا گیا ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واردات مذہب کی حیثیت جیسا کہ قرآن پاک میں ان کا اظہار ہوا ہے اس سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ واردات محض حیاتی نوع کی واردات نہیں ہیں کہ ان کا تعلق صرف صاحب واردات کے اندرون ذات سے ہو لیکن اس سے باہر اس کے گرد و پیش کی معاشرت پر ان کا کوئی اثر نہ پڑے۔ برعکس اس کے یہ وہ انفرادی واردات ہیں جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوئی ہے اور جن کے اولیں نتیجے سے ایک ایسے نظام سیاست کی تاسیس ہوئی جس کے اندر قانونی تصورات مضمر تھے اور جن کی اہمیت کو محض اس لیے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بنیاد وحی والہام پر ہے۔ لہٰذا اسلام کا مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نظام سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے الگ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کا ترک بھی لازم آئے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کے لیے بھی کسی ایسے نظام سیاست پر غور کرنے کے لیے آمادہ ہو گا جو کسی ایسے وطنی یا قومی اصول پر جو اسلام کے اصول اتحاد کی نفی کرے مبنی ہو۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو آج مسلمانان ہندوستان کے سامنے ہے۔ مشہور فرانسیسی عالم رینا (Renan) کا قول ہے کہ انسان نہ نسل کی قید گوارا کر سکتا ہے نہ مذہب کی، نہ دریاؤں کا بہاؤ اس کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے نہ پہاڑوں کی سمتیں اس کے دائرے کو محدود کر سکتی ہیں۔ اگر صحیح الدماغ انسانوں کا ایک زبردست اجتماع موجود ہے اور ان کے دلوں میں جذبات کی گرمی ہے تو انہیں کے اندر وہ اخلاقی شعور پیدا ہو جائے گا جسے ہم لفظ "قوم" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مجھے اس قسم کی ترکیب و اجتماع سے انکار نہیں اگرچہ یہ ایک نہایت ہی طویل و صبر آزما عمل ہے اس لیے کہ اس کا مطلب انسان کی زندگی کو عملاً ایک نئے سانچے میں ڈھالنا ہے اور اس کے جذبات واحساسات کی دنیا کو یکسر پلٹ دینا ہے۔ اگر اکبر کا دین الٰہی یا کبیر کی تعلیمات عوام الناس میں مقبول ہو جاتیں تو ممکن تھا کہ ہندوستان میں بھی اس قسم کی ایک نئی قوم پیدا ہو جاتی لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف مذاہب اور متعدد جاتیوں میں اس قسم کا کوئی رجحان موجود نہیں کہ وہ اپنی انفرادی حیثیت کو ترک کر کے ایک وسیع جماعت کی صورت اختیار کر لیں۔ ہر گروہ اور ہر مجموعہ مضطرب ہے کہ اس کی ہیئت اجتماعیہ قائم رہے۔ لہٰذا اس قسم کا اخلاقی شعور جو رینان کے لیے کسی قوم کی تخلیق کے لیے ناگزیر ہے ایک ایسی عظیم قربانی کا طالب ہے جس کے لیے ہندوستان کی کوئی جماعت تیار نہیں۔ قومیت ہند کا اتحاد ان تمام جماعتوں کی نفی میں نہیں بلکہ ان کے تعاون و اشتراک اور ہم آہنگی پر مبنی ہے۔ صحیح تدبر کا تقاضا ہے کہ ہم حقائق کا خواہ وہ کیسے بھی ناخوشگوار کیوں نہ ہوں اعتراف کریں۔ حصول مقاصد کی عملی راہ یہ نہیں کہ ایک ایسی حالت کو فرض کر لیا جائے جو واقعتاً موجود نہ ہو۔ ہمارا طریق کار یہ ہونا چاہیے کہ ہم واقعات کی تکذیب کی بجائے ان سے جہاں تک ہو سکے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ میری رائے میں ہندوستان اور ایشیا کی قسمت صرف اس بات پر مبنی ہے کہ ہم قومیت ہند کا اتحاد اسی اصول پر قائم کریں۔ اگر ہم ہندوستان کو چھوٹا سا ایشیا قرار دیں تو غیر مناسب نہ ہو گا۔ اہل ہند کا ایک حصہ ان قوموں سے ملتا جلتا ہے جو مغربی اور وسطی ایشیا میں آباد ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ

اگر ہندوستان کے اندر اشتراک و تعاون کی کوئی مؤثر راہ نکل آئی تو اس سے نہ صرف اس قدیم ملک میں جو اپنے باشندوں کی کسی طبعی خرابی کی وجہ سے نہیں بلکہ محض اپنی جغرافی حیثیت کے باعث ایک عرصہ دراز سے مصائب و فتن کا تختہ مشق بن رہا ہے، صلح و آشتی قائم ہو جائے گی بلکہ اس کے ساتھ ہی تمام ایشیا کا سیاسی عقدہ بھی حل ہو جائے گا۔

با ایں ہمہ یہ امر کس قدر افسوس ناک ہے کہ اب تک ہم نے باہمی تعاون و اشتراک کی جس قدر کوششیں کی ہیں سب ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہماری ناکامی کا باعث کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شاید ہمیں ایک دوسرے کی نیتوں پر اعتماد نہیں اور باطنا" ہم تغلب و اقتدار کے خواہشمند ہیں۔ یا یہ ممکن ہے کہ ہم اتحاد و تعاون کے مقاصد عالیہ کے لیے اتنا ایثار بھی نہیں کر سکتے کہ اب تک جو اجارات ہمیں کسی نہ کسی طرح حاصل ہو گئے ہیں ان سے دستبردار ہو جائیں۔ ہم اپنی نفسانیت کو قومیت کے نقاب میں چھپاتے ہیں اور اگرچہ ظاہر طور پر ہمیں ایک نہایت ہی روادارانہ حب الوطنی کا ادعا ہے لیکن دلوں میں ذات پات کی تنگی اور فرقہ آرائی کی ہوس بدستور کام کر رہی ہے۔ ہم لوگ اس اصول کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ہر جماعت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تہذیب و تمدن کے نشو و نما میں آزادی کے ساتھ قدم بڑھائے۔ لیکن ہماری ناکامی کے اسباب کچھ بھی ہوں میرا دل اب بھی امید سے لبریز ہے۔ واقعات کا رجحان بہرکیف ہمارے داخلی اتحاد اور اندرونی ہم آہنگی ہی کی جانب نظر آتا ہے اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے مجھے یہ اعلان کرنے میں مطلق تامل نہیں اگر فرقہ وارانہ امور کے ایک مستقل اور پائدار تصفیے کے لیے اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانان ہندوستان کو اپنی روایات و تمدن کے ماتحت اس ملک میں آزادانہ نشو و نما کا حق حاصل ہے تو وہ اپنے وطن کی آزادی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ یہ اصول کہ ہر فرد اور ہر جماعت اس امر کی مجاز ہے کہ وہ اپنے عقائد کے مطابق آزادانہ ترقی کرے کسی تنگ نظر فرقہ داری پر مبنی نہیں۔ فرقہ داری کی بھی بہت سی صورتیں ہیں۔ وہ فرقہ داری جو دوسری قوموں سے نفرت اور ان کی بدخواہی کی تعلیم دے اس کے ذلیل اور ادنیٰ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ میں دوسری قوموں کے رسوم و قوانین اور ان کے معاشرتی اور مذہبی ادارات کی دل سے عزت کرتا ہوں بلکہ بحیثیت مسلمان میرا یہ فرض ہے کہ اگر ضرورت پیش آئے تو احکام قرآنی کے حسب اقتضا میں ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کروں۔ بایں ہمہ مجھے اس جماعت سے دلی محبت ہے جو میرے اوضاع و اطوار اور میری زندگی کا سرچشمہ ہے اور جس نے اپنے دین اور اپنے ادب، اپنی حکمت اور اپنے تمدن سے بہرہ مند کر کے مجھے وہ کچھ عطا کیا جس سے میری موجودہ زندگی کی تشکیل ہوئی۔ یہ اسی کی برکت ہے کہ میرے ماضی نے از سر نو زندہ ہو کر مجھ میں یہ احساس پیدا کر دیا ہے کہ وہ آپ بھی میری ذات میں سرگرم کار ہے۔ نہرو رپورٹ کے واضعین تک نے بھی فرقہ واری کے اس بلند پہلو کا اعتراف کیا ہے۔ علیحدگی سندھ کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:

"یہ کہنا کہ قومیت کے وسیع نقطہ نگاہ کے ماتحت کسی فرقہ وارانہ صوبے کا قیام مناسب نہیں بالکل

ایسا ہے جیسے یہ دعویٰ کہ بین الاقوامی نصب العین کے سرگرم سے سرگرم حامیوں کو بھی اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ قوموں کی پوری پوری آزادی کے بغیر کسی بین الاقوامی ریاست کا وجود قائم کرنا مشکل ہے اسی طرح مکمل تمدنی آزادی کے بغیر اور یاد رکھیے کہ اپنی ارفع اور اعلیٰ صورت میں فرقہ واری سوائے تمدن کے اور کچھ نہیں' ایک ہم آہنگ اور متوازن قوم کا پیدا کرنا بھی ناممکن ہے۔"

ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان

لہٰذا ثابت ہوا کہ ہندوستان میں ایک متوازن اور ہم آہنگ قوم کے نشوونما کے لیے مختلف ملتوں کا وجود ناگزیر ہے۔ مغربی ممالک کی طرح ہندوستان کی یہ حالت نہیں کہ اس میں ایک ہی قوم آباد ہو۔ وہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہو اور اس کی زبان بھی ایک ہو۔ ہندوستان مختلف اقوام کا وطن ہے جن کی نسل' زبان' مذہب سب ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ان کے اعمال و افعال میں وہ احساس پیدا ہی نہیں ہو سکتا جو ایک ہی نسل کے مختلف افراد میں موجود رہتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ہندو بھی تو کوئی واحد الجنس قوم نہیں۔ پس یہ امر کسی طرح بھی مناسب نہیں کہ مختلف ملتوں کے وجود کا خیال کیے بغیر ہندوستان میں مغربی اصول جمہوریت پر عمل کرنا شروع کر دیا جائے۔ مسلمانوں کا مطالبہ بالکل بجا ہے وہ ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان قائم کریں۔ میری رائے میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قراردادوں سے اسی بلند نصب العین کا اظہار ہوتا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ مختلف ملتوں کے وجود کو فنا کیے بغیر ان سے ایک متوافق اور ہم آہنگ قوم تیار کی جائے تاکہ وہ آسانی کے ساتھ اپنے ان ممکنات کو جو ان کے اندر مضمر ہیں عمل میں لا سکیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اجتماع ان تمام مطالبات کی جو اس قرارداد میں موجود ہیں نہایت شد و مد سے تائید کرے گا۔ ذاتی طور پر میں ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب' صوبہ سرحد' سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے۔ خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے خواہ اس کے باہر۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی۔ اس تجویز کو نہرو کمیٹی میں بھی پیش کیا گیا تھا لیکن اراکین مجلس نے اس بنا پر رد کر دیا کہ اگر اس قسم کی کوئی ریاست قائم ہوئی تو اس کا رقبہ اس قدر وسیع ہو گا کہ اس کا انتظام کرنا دشوار ہو جائے گا۔ بیشک اگر رقبے کا لحاظ کیا جائے تو اراکین مجلس کا یہ خیال صحیح ہے۔ لیکن آبادی پر نظر کی جائے تو اس ریاست کے باشندوں کی تعداد اس وقت کے بعض ہندوستانی صوبوں سے بھی کم ہو گی۔ غالباً قسمت انبالہ یا اس قسم کے دوسرے اضلاع کو الگ کر دینے سے' جن میں ہندو آبادی کا غلبہ ہے اس کی وسعت اور انتظامی مشکلات میں اور بھی کمی ہو جائے گی۔ پھر ان اضلاع کی علیحدگی سے غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کہیں زیادہ محفوظ ہو جائیں گے۔ اس تجویز کو سن کر نہ انگریزوں کو پریشان ہونا چاہیے نہ ہندوؤں کو۔ ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لیے

ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اس زندہ اور جاندار طبقے کی مرکزیت کی بدولت جس نے دولت برطانیہ کی نا انصافیوں کے باوجود فوج اور پولیس میں شریک ہو کر انگریزوں کو اس قابل بنایا ہے کہ وہ اس ملک پر اپنی حکومت قائم رکھیں، ہندوستان ہی کا مسئلہ حل نہیں ہو جائے گا بلکہ اس سے خود مسلمانوں کے احساسات ذمہ داری قوی ہو جائے گی اور ان کا جذبہ حب الوطنی بڑھ جائے گا۔ اگر شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو اس امر کا موقعہ دیا گیا کہ وہ ہندوستان کے جسد سیاسی کے اندر رہ کر اپنے نشو و ارتقا میں آزادانہ قدم اٹھا سکیں تو وہ تمام بیرونی حملوں کے خلاف، خواہ وہ حملہ بزور قوت ہو یا بزور خیالات، ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے۔ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی ۵۶ فیصدی ہے لیکن ہندوستان کی پوری فوج میں ہمارا حصہ ۵۴ فیصدی ہے اور اگر عساکر ہند کی کل تعداد میں سے ان ۱۹ ہزار گورکھوں کو جو نیپال کی آزادی ریاست سے بھرتی کیے جاتے ہیں، نکال دیا جائے تو مسلمانوں کی تعداد ۶۲ فیصدی ہو جائے گی۔ حالانکہ اس اندازے میں وہ چھ ہزار جنگجو شامل نہیں جو بلوچستان اور صوبہ سرحد سے بھرتی کیے جاتے ہیں۔ اس سے آپ ان تمام صلاحیتوں کا باسانی اندازہ کر سکیں گے جو شمال مغربی ہندوستان کی مسلم آبادی میں موجود ہیں اور جن کی بدولت وہ تمام ہندوستان کو غیر ملکی چیرہ دستیوں سے محفوظ و مامون رکھ سکتی ہے۔ رائٹ آنریبل مسٹر سری نواس شاستری کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ شمال مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ خود مختار اسلامی ریاستیں قائم کی جائیں ان کی اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ اگر ضرورت پیش آئے تو حکومت ہند پر زور ڈالا جا سکے۔ میں یہ عرض کروں گا کہ مسلمانان ہندوستان کے دل میں اس قسم کا کوئی جذبہ موجود نہیں۔ ان کا مدعا صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنی ترقی کی راہ میں آزادی کے ساتھ قدم بڑھائیں لیکن یہ اس مرکزی حکومت کے ماتحت ممکن نہ ہو گا جسے قوم پسند ہندو ارباب سیاست محض اس لیے قائم کرنا چاہتے ہیں کہ ان کو دوسری ملتوں پر ہمیشہ کے لیے غلبہ حاصل ہو جائے۔

بہرحال ہندوؤں کے دل میں اس قسم کا کوئی خدشہ نہیں ہونا چاہیے کہ آزاد اسلامی ریاستوں کے قیام سے ایک طرح کی مذہبی حکومت قائم ہو جائے گی۔ میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ اسلام میں مذہب کا مفہوم کیا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں بلکہ یہ ایک ریاست ہے جس کا اظہار روسو سے بھی کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا جو عقد اجتماعی کا پابند ہو۔ ریاست اسلامی کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان شجر و حجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے اور اس کے ایک زندہ جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کا مالک ہے۔ اسلامی ریاست کی نوعیت کا اندازہ ٹائمز آف انڈیا کے اس افتتاحیہ سے کیا جا سکتا ہے جس میں لکھا ہے کہ قدیم ہندوستان میں ریاست کا یہ فرض تھا کہ وہ سود کے متعلق قوانین بنائے لیکن باوجود اس کے کہ اسلام میں سود لینا حرام ہے اسلامی حکومت نے شرح سود پر کوئی پابندیاں عائد نہیں کیں۔ میں صرف ہندوستان اور اسلام کے فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر

توازن قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اس امر کا موقعہ ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں' اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن' شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گی۔

فیڈرل ریاستیں

میرے خیال میں اب یہ حقیقت اچھی طرح سے واضح ہو گئی ہے کہ اگر ہم ہندوستان کی آئندہ حکومت کے لیے کسی مستقل دستور کی بنا رکھنا چاہتے ہیں تو ہندوستان کے جغرافی' نسلی' لسانی اور عقائد و معاشرت کے اختلافات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسی آزاد ریاستیں قائم کر دیں جو زبان' نسل' تاریخ' مذہب اور اقتصادی مفاد کے اشتراک پر مبنی ہوں۔ سائمن رپورٹ کے اندر فیڈریشن کا جو تصور قائم کیا گیا ہے اس کے ماتحت بھی ضروری ہے کہ مرکزی مجلس وضع قوانین کا انتخاب عوام سے عمل میں نہ آئے بلکہ وہ فیڈرل ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل ہو۔ سائمن رپورٹ کی رو سے تقریباً انہی اصولوں کی بنا پر جن کا اظہار میں نے کیا ہے صوبوں کی تقسیم بھی از سرنو ہو جانی چاہیے۔ میں ان دونوں تجاویز کی دل سے تائید کرتا ہوں بلکہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی عرض کروں گا کہ صوبوں کی جدید تقسیم سے بیشتر دو شرطوں کا پورا ہو جانا ضروری ہے' اولاً یہ تقسیم نئے دستور کے اجرا سے پہلے مکمل ہو جانی چاہیے' ثانیاً اس کی نوعیت ایسی ہو کہ اس سے فرقہ وارانہ مسائل ہمیشہ کے لیے طے ہو جائیں۔ اگر صوبوں کی تقسیم کسی صحیح اصول کی بنا پر ہو گئی تو اس سے مخلوط اور جداگانہ انتخابات کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو جائے گا۔ میری رائے میں اس سارے جھگڑے کی بنا صوبوں کی موجودہ تقسیم پر ہے۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ جداگانہ انتخابات کا اصول قومیت کے منافی ہے۔ ان کے نزدیک لفظ قومیت کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ ہندوستان کے تمام باشندے باہم اس طرح خلط ملط ہو جائیں کہ ان کے اندر کسی مخصوص ملت کا انفرادی وجود باقی نہ رہے۔ لیکن ہندوستان کی یہ حالت نہیں۔ نہ ہم اس کے آرزو مند ہیں۔ ہندوستان میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کی معاشی پستی' ان کے بے حد مقروضیت (بالخصوص پنجاب میں) اور بعض صوبوں میں ان کی ناکافی اکثریتوں کا بھی خیال کر لیا جائے تو آپ کی سمجھ میں آ جائے گا کہ مسلمان جداگانہ انتخابات کے لیے کیوں مضطرب ہیں۔ ہندوستان جیسے ملک میں اور خاص طور سے ان حالات میں جو اس وقت یہاں ہیں اس امر کی توقع رکھنا کہ علاقہ وارانہ انتخابات سے ہر ملت کے مفاد کی پوری پوری نمائندگی ہو سکے گی ناممکن ہے سوائے اس کے کہ تمام اقلیتوں پر ہندوؤں کا تغلب قائم ہو جائے کہ ہر صوبے کے اندر تقریباً ایک ہی طرح کی ملتیں بستی ہوں اور ان کی نسل' ان کی زبان' ان کا مذہب اور ان کی تہذیب و تمدن ایک ہو تو مسلمانوں کو مخلوط انتخابات پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔

سائمن رپورٹ اور فیڈریشن

لیکن جہاں تک مرکزی فیڈرل ریاست کے اختیارات کا تعلق ہے ہندو اور انگریز پنڈتوں نے جو دستور حکومت طیار کیا ہے اس سے اس باریک اختلاف کا صاف پتہ چل جاتا ہے جو ان دونوں کے مقاصد میں موجود ہے۔ ہندوستان کے پنڈتوں کو یہ منظور نہیں کہ مرکزی حکومت کے موجودہ اختیارات میں سرمو بھی فرق آئے۔ ان کا مطالبہ صرف اس قدر ہے کہ ان اختیارات کو مجلس وضع قوانین کی رضامندی پر چھوڑ دیا جائے جس میں اس وقت بھی انہیں کی کثرت ہے اور جب اراکین کی نامزدگی کا طریق ختم ہوا تو یہ کثرت اور بھی زیادہ ہو جائے گی۔ اس کے برعکس انگلستان کے پنڈتوں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اگر مرکزی حکومت میں اصول جمہوریت کا اطلاق ہو گیا تو اس کا نتیجہ ان کے مفاد کے خلاف ہو گا کیونکہ مزید اختیارات مل جانے پر تمام قوت ان کے ہاتھوں سے نکل جائے گی' یہ طے کیا ہے کہ وہ اپنے اصول جمہوریت کا تجربہ مقامی حکومتوں میں کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے فیڈریشن کے اصول پر عمل کرنے کا خیال ظاہر کیا ہے بلکہ اس کے متعلق کچھ تجاویز بھی پیش کر دی ہیں لیکن انہوں نے اس اصول پر جس پہلو سے غور کیا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو مسلمانان ہند کے پیش نظر ہے۔ مسلمانوں نے فیڈریشن کا مطالبہ محض اس لیے کیا ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلے کے تصفیے کی صرف یہی ایک صورت ہے۔ برخلاف اس کے شاہی کمیشن کے ارکان کے ذہن میں فیڈریشن کا جو تصور ہے وہ اصولی طور سے کسی قدر بھی درست اور مستحکم کیوں نہ ہو اس سے فیڈرل ریاستوں میں کسی خود اختیاری حکومت کا قائم ہونا مشکل ہے - ان کی غرض صرف اس قدر ہے کہ اصول جمہوریت کے نفوذ سے ہندوستان میں جو صورت حالات پیدا ہو گئی ہے اس سے فرار کی کوئی راہ نکل آئے۔ فرقہ وارانہ مسئلے پر انہوں نے کوئی عذر نہیں کیا بلکہ اسے ویسے ہی چھوڑ دیا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک حقیقی فیڈریشن کا تعلق ہے سائمن رپورٹ کی تجاویز نے اس کی پوری پوری نفی کر دی۔ نہرو رپورٹ نے محض اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ مرکزی مجلس وضع قوانین میں ہندوؤں کی اکثریت ہے وحدتی نظام کی سفارش کی کیونکہ اس سے تمام ہندوستان پر باسانی ہندوؤں کا تغلب قائم ہو جاتا ہے۔ سائمن رپورٹ نے محض ایک لفظی فیڈریشن کی اسکیم پیش کی ہے جس کی تہ میں برطانیہ کا اقتدار بدستور قائم رہے گا۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ انگریز "طبعاً" اس اقتدار سے دستبردار ہونا پسند نہیں کرتے جو اب تک انہیں حاصل رہا ہے اور کچھ یہ کہ اگر فرقہ وارانہ مسئلے کا تصفیہ نہ ہو سکا تو ان کے ہندوستان پر "مستقلاً" اپنا قبضہ رکھنے کے لیے ایک اچھا عذر مل جائے گا۔ میں اس امر کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ہندوستان میں وحدتی حکومت قائم ہو۔ جن اختیارات کو "فاضل" (Residuary) کہا جاتا ہے وہ صرف آزاد ریاستوں کو ملنا چاہیے۔ مرکزی فیڈرل ریاست کے ذمے صرف ایسی اختیارات رہنا چاہیے جو تمام فیڈرل ریاستیں بطیب خاطر اس کے سپرد کر دیں۔ میں مسلمانان ہندوستان کو کبھی یہ رائے نہیں دوں گا کہ وہ کسی ایسے نظام حکومت سے خواہ وہ برطانوی ہو یا ہندی اظہار اتفاق کریں جو حقیقی فیڈریشن کے اصول پر مبنی نہ ہو یا جس میں ان کے جداگانہ سیاسی وجود کو تسلیم نہ کیا جائے۔

فیڈرل اسکیم اور راؤنڈ ٹیبل کانفرنس

پیشتر اس کے کہ انگریز مرکزی حکومت میں اساسی تبدیلی کے لیے کوئی مؤثر ذریعہ پیدا کرتے اس امر کو محسوس کر لیا گیا تھا کہ اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آخر الامر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں والیان ریاست کی شمولیت کو بھی ضروری قرار دیا گیا۔ اس سے باشندگان اور بالخصوص اقلیتوں کو بجا طور پر تعجب ہوا کہ والیان ریاست نے کس قدر تیزی کے ساتھ اپنی رائے بدل لی اور ہندوستان کے فیڈریشن میں شامل ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ہندوؤں نے بھی جو اب تک وحدتی حکومت کے طرف دار چلے آتے تھے بغیر کسی تکلف کے فیڈریشن کے اصول سے اتفاق کر لیا۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے جب مسٹر شاستری نے سر جان سائمن کی فیڈریشن والی اسکیم پر نہایت سختی سے نکتہ چینی کی تھی لیکن وہ بھی دفعتاً" فیڈریشن پر رضامند ہو گئے اور اپنی اس رضامندی کا اظہار کانفرنس کے ابتدائی اجلاس ہی میں کر دیا جس سے وزیراعظم انگلستان کو موقعہ ملا کہ وہ اپنی آخری تقریر میں چند نہایت ہی برجستہ اشارات کر سکیں۔ یہ سب کچھ خالی از علت نہیں۔ انگریزوں نے والیان ریاست کو فیڈریشن میں شریک ہونے کی دعوت دی اور ہندو چپ چاپ اس پر رضامند ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ والیان ریاست کی شرکت سے جن میں مسلمانوں کی تعداد نہایت کم ہے دو مقصد حاصل ہوتے ہیں، ایک طرف وہ ہندوستان پر برطانوی اقتدار کے تسلسل میں مدد دیں گے، دوسری طرف ہندوؤں کو فیڈرل کے اسمبلی میں ان کی بدولت اکثریت حاصل ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ مرکزی حکومت کی شکل کے متعلق ہندو اور مسلمانوں میں جو اختلاف موجود ہے انگریز مدبرین والیان ریاست کے ذریعے نہایت چالاکی کے ساتھ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ خود والیان ریاست بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس اسکیم کے ماتحت ان کی مستبدانہ حکومت اور بھی زیادہ مضبوط ہو جائے گی۔ اگر مسلمانوں نے اس اسکیم کو خاموشی کے ساتھ منظور کر لیا تو ان کا سیاسی وجود تھوڑے ہی عرصے میں کالعدم ہو جائے گا، کیونکہ اس قسم کے فیڈریشن میں ہندو والیان ریاست کی اکثریت ہو گی اور وہی حکومت کے سیاہ و سفید کے مالک ہوں گے۔ اگر دولت برطانیہ کے مفاد کا سوال درپیش ہو گا تو وہ حکومت انگلستان کا ساتھ دیں گے لیکن جہاں تک ملک کے اندرونی نظم و نسق کا تعلق ہے وہ ہندوؤں کا تسلط اور اقتدار قائم رکھیں گے۔ بالفاظ دیگر یہ اسکیم برطانوی حکومت اور ہندو ہندوستان کے درمیان ایک قسم کی مفاہمت ہے یعنی اگر تم میرا اقتدار ہندوستان پر قائم رکھو تو میں تمہیں ایک ایسی حکومت قائم کرنے میں مدد دوں گا جس میں تمہارا یعنی ہندوؤں کا غلبہ ہو گا۔ لہٰذا اگر برطانوی ہندوستان کے تمام صوبے حقیقتاً خود مختار ریاستوں کی صورت اختیار نہ کر لیں تو پھر فیڈریشن میں والیان ریاست کی شرکت کا مطلب صرف اسی قدر ہو سکتا ہے کہ انگریز مدبرین اپنے اختیارات سے دستبردار ہوئے بغیر نہایت چالاکی کے ساتھ تمام جماعتوں کو خوش کر دینا چاہتے ہیں ۔ مسلمانوں کے لیے لفظاً فیڈریشن، ہندوؤں کو مرکز میں اکثریت اور انگریز حامیان سلطنت کو خواہ وہ ٹوری جماعت سے ہوں یا مزدور سے، حقیقی اختیارات کی قوت ہے۔

ہندوستان میں ہندو ریاستوں کی تعداد اسلامی ریاستوں سے کہیں زیادہ ہے لہٰذا یہ دیکھنا باقی ہے کہ مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ انہیں مرکزی فیڈرل اسمبلی میں ۳۳ فیصدی نشستیں حاصل ہوں اس ایک ایوان یا ایوانات میں کیونکر پورا کیا جائے گا جو دیسی ریاستوں اور برطانوی ہندوستان دونوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمان مندوبین فیڈرل حکومت کے اس مفہوم کو اچھی طرح سمجھتے ہیں جیسا کہ کانفرنس میں اس پر غور و خوض ہو رہا ہے۔ ابھی آل انڈیا فیڈریشن میں مسلمانوں کی نیابت کا مسئلہ پیش نہیں آیا۔ البتہ رائٹر سے مختصراً یہ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ اس وقت جو رپورٹ پیش ہوئی ہے اس میں دو ایوانوں کی سفارش کی گئی ہے جن میں برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں کے نمائندے شریک ہوں گے لیکن ان کی تعداد کے مسئلے پر اس وقت بحث ہو گی جب کمیٹی ان عنوانات پر غور کرے گی جن کو ابھی سب کمیٹی کے ذمے نہیں کیا گیا۔ میری رائے میں تناسب کا سوال نہایت اہم ہے اور بہتر ہوتا کہ اسمبلی کی ہیئت ترکیبی کے ساتھ اس پر بھی بحث ہو جاتی۔

میرے نزدیک سب سے بہتر صورت یہ تھی کہ ابتدا میں فیڈریشن صرف برطانیہ علاقے تک محدود ہوتا' کسی ایسی فیڈرل اسکیم سے بھی جو استبداد اور جمہوریت کے ناپاک اتحاد پر مبنی ہو سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہو سکتا کہ برطانوی ہندوستان بدستور وحدتی حکومت کا تختہ مشق بنا رہے۔ یہ وحدتی حکومت ممکن ہے کہ انگریزوں کے لیے مفید ہو اور والیان ریاست اور اکثریت کے لیے بھی۔ لیکن اس سے مسلمانوں کے لیے فائدے کی کوئی توقع رکھنا بے سود ہے جب تک کہ انہیں ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے پانچ میں پورے پورے "فاضل" اختیارات کے ساتھ اکثریت کے حقوق حاصل نہ ہو جائیں اور مرکزی فیڈرل اسمبلی کی کل تعداد میں انہیں ۳۳ فیصدی نشستیں نہ ملیں۔ جہاں تک کہ برطانوی ہند کے صوبوں کے لیے حاکمانہ (Severeign) اختیارات کا تعلق ہے ہزہائینس نواب بھوپال' سر اکبر حیدری اور مسٹر جناح کا رویہ سراسر حق بجانب ہے۔ چونکہ اب والیان ریاست بھی فیڈریشن میں شریک ہو رہے ہیں لہٰذا مرکزی مجلس کے متعلق ہمیں اپنے مطالبے کو نئی شکل میں پیش کرنا چاہیے۔ اب یہ مسئلہ محض برطانوی ہند کی اسمبلی میں تناسب کا نہیں رہا بلکہ اب سوال آل انڈیا فیڈریشن سے مسلمانوں کی نمائندگی کا ہے ہمارا مطالبہ یہ ہونا چاہیے کہ ان اسلامی ریاستوں کے علاوہ جو فیڈریشن میں شریک ہوں ہمیں تمام فیڈریشن میں ۱/۳ نشستیں حاصل ہوں۔

مسئلہ دفاع

ہندوستان میں فیڈرل نظام قائم کرنے میں ایک بہت بڑی دقت دفاع و حفاظت کی ہے۔ شاہی کمیشن کے ارکان نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے تمام نقائص کو پیش نظر رکھ لیا ہے تاکہ جنگی نظم و نسق کی باگ ہمیشہ دولت برطانیہ کے ہاتھ میں رہے۔

انہوں نے لکھا ہے:

" ہندوستان اور برطانیہ کا تعلق کچھ ایسا ہے کہ ہندوستان کے مسئلہ دفاع کو نہ اب نہ مستقبل

قریب میں محض ہندوستانی مسئلہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ دفاعی عساکر کا نظم و نسق ہمیشہ نائبین سلطنت کے ہاتھوں میں رہنا چاہیے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہیے کہ جب تک برطانوی افواج اور برطانوی افسروں کی مدد کے بغیر ہندوستانی اپنی سرحدوں کی حفاظت کے قابل نہ ہو جائیں، برطانوی ہندوستان میں ذمہ دارانہ حکومت قائم نہیں ہو سکتی؟ موجودہ حالات میں اس امر سے انکار کرنا مشکل ہے کہ یہ واقعی ہندوستان کی آئینی ترقی کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے۔ اگر نہرو رپورٹ کے اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ جب کبھی ہندوستان کو مزید اختیارات حاصل ہوں ان کا مطلب یہ بھی ہو گا کہ فوجوں کا نظم و نسق ہندوستان کی منتخبہ مجلس وضع قوانین کے ماتحت ہو تو وہ تمام امیدیں جو اس امر سے وابستہ ہیں کہ مرکزی حکومت بتدریج اس منزل کی طرف بڑھے جس کا اعلان ۲ اگست ۱۹۱۷ء میں ہوا تھا معرض خطر میں آ جائے گی۔"

اپنے بیان کی مزید تائید کے لیے ارکان کمیشن نے آگے چل کر اس امر پر خاص زور دیا ہے کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب اور مختلف نسلوں کے درمیان، جن کی صلاحیتیں اور قوتیں ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہیں، ایک تصادم رونما ہے۔ پھر یہ کہہ کر اس مسئلے کو اور بھی زیادہ پیچیدہ بنانے کی کوشش کی ہے کہ:

> "یہ حقیقت کہ ہمارے عام اور مروجہ الفاظ میں ہندوستانی ایک قوم نہیں ہیں اور بھی عیاں ہو جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کی جنگجو قوموں اور دوسری نسلوں میں کس قدر فرق موجود ہے۔"

اس مسئلے کے ان پہلوؤں پر زور دینے کا مقصد یہ ہے کہ انگریز صرف بیرونی حملوں ہی سے ہندوستان کی حفاظت نہیں کر رہے ہیں بلکہ وہ اس کے اندرونی امن و سکون کے بھی "غیر جانبدار محافظ" ہیں۔ بہرحال فیڈریشن میں، جیسا کہ میں اس کا مطلب سمجھتا ہوں، اس مسئلے کا صرف ایک پہلو باقی رہ جائے گا یعنی ہندوستان کے خارجی تحفظ کا۔ صوبہ جاتی عساکر کے علاوہ جو ہندوستان کے اندرونی امن و سکون کے لیے ناگزیر ہیں، ہندوستان کی فیڈرل کانگریس صوبہ سرحدی میں ایک طاقتور سرحدی لشکر متعین کر سکتی ہے جس میں ہر صوبے کے سپاہی شامل ہوں گے اور جن کی قیادت پر ملت کے آزمودہ کار افسروں کے ہاتھ میں ہو گی۔ مجھے اس امر کا بخوبی احساس ہے کہ ہندوستان میں قابل فوجی افسر موجود نہیں اور یہی چیز ہے جس سے فائدہ اٹھا کر ارکان کمیشن یہ کہتے ہیں کہ افواج کا نظم و نسق دولت برطانیہ کے ہاتھوں میں ہونا چاہیے۔ لیکن میں اس کے متعلق انہی کی رپورٹ سے ایک اقتباس پیش کروں گا جس سے خود ان کا انداز قابل اعتراض نظر آتا ہے:

> "اس وقت کوئی ہندوستانی جسے ملک معظم کی طرف سے کمیشن ملا ہو کپتان سے اونچے عہدے پر فائز نہیں۔ ہندوستانی کپتانوں کی کل تعداد ۳۹ ہے جن میں ۲۵ معمولی رجمنٹوں میں کام کرتے ہیں ان میں سے بعض کی عمر اس قدر زیادہ ہے کہ اگر وہ ضروری امتحانات میں کامیاب بھی ہو جائیں جب بھی انہیں اس سے اونچا عہدہ حاصل نہیں ہو سکے

گا- ان کا اکثر حصہ سینڈ ہرسٹ نہیں گیا بلکہ انہیں جنگ عظیم میں کیمشن ملا تھا- اب یہ خواہش کہ صورت حالات میں تغیر پیدا کیا جائے کس قدر تدریجی کیوں نہ ہو اور اس کے لیے کیسی بھی مخلصانہ کوشش کیوں نہ کی جائے وہ شرائط جن کو اس کی کمیٹی نے (جس کے صدر اور فوجی سیکرٹری کے علاوہ تمام اراکین ہندوستانی تھے) نہایت مؤثر طریق پر لفظ "ترقی" ... میں جمع کر دیا ہے اور امر پر منحصر ہیں کہ ہر مرحلے پر کامیابی حاصل ہو اور جنگی قابلیت بدستور قائم رہے- ظاہر ہے کہ اس سے ترقی کی رفتار لازماً ست رہے گی- موجودہ ہندوستانی افسر معمولی عہدوں پر کام کرتے ہیں اور ان کا تجربہ محدود ہے لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ وہ ایک قلیل عرصے کے اندر اعلیٰ مراتب حاصل کر لیں - جب تک ہندوستانی امیدواروں کی قلیل جماعت میں اضافہ نہ ہو جائے اور ہم اس اضافے کے دل سے خواہشمند ہیں' جب تک ہندوستانیوں کی ایک کافی تعداد اس قدر تجربہ اور مہارت حاصل نہ کر لے کہ جس سے سب نہیں تو کم از کم کچھ رجمنٹوں کے تمام افسر صرف ہندوستانی ہوں' جب تک یہ رجمنٹیں عملاً اس آزمائش میں کامیاب نہ ہو جائیں جو ان کی قابلیت کا اندازہ کرنے کا ایک ہی ذریعہ' ہے اس وقت تک یہ ممکن نہ ہو گا کہ فوج کے نظم ونسق کو ہندوستانیوں کے ذمے سپرد کر دیا جائے اور یہ عمل اس حد تک پہنچ جائے کہ ساری فوج کلیتہً ہندوستانی ہو جائے- اس حالت میں بھی اس کام کی تکمیل کے لیے سالہا سال کی ضرورت ہو گی-"

اب میں یہ عرض کرنے کی جرات کروں گا کہ اس صورت حالات کا ذمہ دار کون ہے؟ اس کی وجہ ہماری جنگجو قوموں کی کوئی فطری خرابی ہے یا فوجی تعلیم کی ست و رفتار؟ ہماری جنگجو قوموں کی صلاحیت مسلمہ ہے- البتہ یہ ممکن ہے کہ یہ نسبت تعلیم کے دوسرے شعبوں کے' جنگی تعلیم کا عمل ست ہو- میں عسکریات کا ماہر نہیں لیکن ایک عام آدمی کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ اس دلیل کو جس انداز میں پیش کیا گیا ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ عمل ہمیشہ جاری رہے گا- گویا ہندوستان کی غلامی کبھی ختم نہیں ہو گی- لہٰذا ضروری ہے کہ نہرو رپورٹ کی تجویز کے مطابق سرحدی افواج کا نظم و نسق ایک دفاعی کمیٹی کے ذمے کر دیا جائے اور اس کے ارکان کا فیصلہ باہمی تصفیے سے ہو-

ایک عجیب بات یہ ہے کہ سائمن رپورٹ میں ہندوستان کی بری سرحدوں کو تو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے لیکن اس کے بحری تحفظ کے متعلق صرف سرسری اشارات کیے گئے ہیں - اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان پر ہمیشہ خشکی کے راستے سے حملے ہوتے رہے ہیں لیکن یہ امر بھی مسلم ہے کہ ہندوستان کے موجودہ حاکم اس کے غیر محفوظ سواحل ہی کی وجہ سے اس پر قابض ہوئے تھے- ایک آزاد اور خود مختار ہندوستان کے لیے از بس ضروری ہے کہ وہ خشکی کی بجائے اپنی بحری سرحدوں کی سر زیادہ حفاظت کرے-

مجھے یقین ہے کہ اگر فیڈرل ریاست قائم ہو گئی تو مسلم فیڈرل ریاستیں ہندوستان کے تحفظ کی خاطر

ایک غیر جانبدار ہندوستانی فوج کے قیام کے لیے جو خشکی اور سمندر دونوں پر متعین ہو' ہر قسم کی مدد دینے پر آمادہ ہوں گی۔ مغلوں کے زمانے میں اس قسم کے غیر جانبدار عساکر واقعتہ" موجود تھے بلکہ اکبر کے زمانے میں تو ان تمام سرحدی افواج کے افسر ہندو ہی تھے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر فیڈرل نظام حکومت میں ایک غیر جانبدارانہ ہندوستانی لشکر قائم ہوا تو اس سے مسلمانوں کے جذبات حب الوطنی اور زیادہ قوی ہو جائیں گے اور اس بدگمانی کا بھی ازالہ ہو جائے گا کہ اگر باہر سے کوئی حملہ ہوا تو مسلمانان ہندوستان اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ مل جائیں گے۔

اسلامی مطالبات

میں نے مختصرا اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ ہندوستان کے دو آئینی مسئلوں کے متعلق ہم مسلمانوں کو کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔ ہمارا سب سے بڑا مطالبہ یہ ہے کہ فرقہ وارانہ مسائل کے مستقل تصفیے کے لیے برطانوی ہندوستان میں صوبوں کی تقسیم از سرنو ہو جائے لیکن اگر مسلمانوں کا یہ مطالبہ مسترد کر دیا جائے تو پھر میں نہایت شد و مد کے ساتھ ان مطالبات کی تائید کروں گا جن کا اعلان آل انڈیا مسلم کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ میں بار بار کیا گیا ہے مسلمانان ہندوستان کسی ایسی آئینی تبدیلی کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے جس کے ماتحت وہ بنگال اور پنجاب میں جداگانہ انتخابات کے ذریعے اپنی اکثریت حاصل نہ کر سکیں یا مرکزی مجلس میں انہیں ۳۳ فیصدی نشستیں نہ مل جائیں۔ اب تک مسلمانوں کے سیاسی رہنما دو گڑھوں میں گر چکے ہیں' پہلا گڑھا لکھنؤ کا مسترد شدہ میثاق ہے جسے قومیت ہند کے غلط تصور پر مرتب کیا گیا تھا اور جس کے ماتحت مسلمان ان تمام مواقع سے محروم رہ جاتے تھے کہ وہ اس ملک میں کوئی سیاسی طاقت پیدا کر سکیں' دوسرا گڑھا پنجاب کی نام نہاد دیہاتی آبادی کی خاطر اسلامی اتحاد و اتفاق کی وہ ناعاقبت اندیشانہ قربانی ہے جس کا اظہار ایک ایسی تجویز میں ہوا ہے جس سے پنجاب کے مسلمان اقلیت میں رہ جاتے ہیں۔ لیگ کا فرض ہے کہ وہ میثاق کی اور اس تجویز دونوں کی مذمت کرے۔

سائمن رپورٹ نے مسلمانوں کے ساتھ ایک بہت بڑی ناانصافی کی ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے بنگال اور پنجاب میں ان کے لیے ایک آئینی اکثریت کی سفارش نہیں کی۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ مسلمان یا تو میثاق لکھنؤ کے پابند رہیں یا مخلوط انتخابات کو اختیار کر لیں۔ حکومت ہند نے سائمن رپورٹ کے متعلق جو یادداشت بھیجی ہے اس میں اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ رپورٹ کی اشاعت کے بعد مسلمانوں نے ان دونوں تجویزوں میں سے کسی ایک کو بھی پسند نہیں کیا۔ یاداشت میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کی یہ شکایت بجا ہے کہ انہیں بنگال اور پنجاب مین تناسب آبادی کے لحاظ سے نمائندگی کا حق کیوں نہیں دیا گیا۔ محض یہ امر کہ ان کو دوسرے صوبوں میں "پاسنگ" حاصل ہے اس نقصان کی تلافی نہیں کرتا۔ لیکن تعجب خیز بات یہ ہے کہ اس یادداشت میں بھی مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے حکومت ہند نے بھی اسی "نہایت احتیاط سے تیار کی

ہوئی متوازن اسکیم" کی حمایت کی ہے جس کو پنجاب کونسل کے سرکاری ممبروں نے مرتب کیا تھا اور جس کے ماتحت مسلمانان پنجاب کو پوری مجلس میں صرف ۴۹ فیصدی نشستیں ملتی ہیں اور ہندوؤں اور سکھ اراکین پر صرف دو کی اکثریت حاصل ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ پنجاب کی مثال بجائے خود اس قدر فیصلہ کن ہے کہ اس کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مسلمانان پنجاب کسی ایسی اسکیم کو تسلیم نہیں کر سکیں گے جس کی رو سے انہیں پوری مجلس میں قطعی اکثریت حاصل نہیں ہو جائے۔ بہرحال لارڈ ارون اور ان کی حکومت کو اس امر سے اتفاق ہے کہ جب تک حق رائے دہندگی اس قدر وسیع نہ ہو جائے کہ ہر ملت کا تناسب آبادی واضح طور پر اس کے نمائندوں سے ظاہر ہو سکے اور جب تک تمام مسلمان باتفاق رائے جداگانہ نمائندگی کے حق سے دستبردار نہ ہو جائیں، ہندوستان کی اقلیتیں اس امر کی مجاز ہوں گی کہ فرقہ وارانہ انتخابات کو قائم رکھیں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب حکومت ہند کے نزدیک مسلمانوں کی شکایت بجا ہے تو اسے اتنی جرات کیوں نہیں ہوئی کہ وہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے لیے آئینی اکثریت کی سفارش کرتی۔

مسلمانان ہندوستان کو کسی ایسی تبدیلی سے بھی اتفاق نہیں ہو گا جس کے ماتحت سندھ کو ایک علیحدہ صوبہ نہ کر دیا جائے یا شمال مغربی سرحدی صوبے کا سیاسی درجہ وہی نہ ہو جائے جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کا ہے۔ سندھ اور بلوچستان کو باہم ملا کر ایک نیا صوبہ قائم کر دینا چاہیے۔ احاطہ بمبئی اور سندھ میں کوئی چیز بھی تو مشترک نہیں۔ ارکان کمیشن کو بھی اعتراف ہے کہ اہل سندھ کی زندگی اور ان کا تمدن عراق اور عرب سے مشابہ ہے نہ کہ ہندوستان سے۔ مشہور اسلامی جغرافیہ دان مسعودی نے آج سے بہت پہلے عرب اور سندھ کی اسی باہمی مشابہت کی طرف اشارا کر دیا تھا۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ سندھ وہ ملک ہے جو مملکت اسلامی سے قریب تر ہے"۔ سب سے پہلے اموی خلیفہ کا قول تھا کہ مصر کی پشت افریقہ کی جانب ہے اور منہ عرب کی طرف۔ مناسب رد و بدل کے ساتھ یہی کچھ سندھ کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے۔ سندھ کی پیٹھ ہندوستان کی طرف ہے اور منہ وسط ایشیا کی جانب۔ علاوہ ازیں اگر سندھ کے ان زراعتی مسائل جن سے حکومت بمبئی کو مطلق ہمدردی نہیں اور اس کی بے شمار تجارتی صلاحیتوں کا لحاظ رکھ لیا جائے اس لیے کہ کراچی بڑھتے بڑھتے ایک روز لازماً ہندوستان کا دوسرا دارالسلطنت بن جائے گا' تو صاف نظر آ جاتا ہے کہ اس کو احاطہ بمبئی سے ملحق رکھنا مصلحت اندیشی سے کس قدر دور ہے۔ بیشک اس وقت بمبئی کا رویہ دوستانہ ہے لیکن ممکن ہے کہ وہ کل ہی اس کا حریف بن جائے۔ کہا جاتا ہے کہ اس راہ میں کچھ مالی مشکلات حائل ہیں۔ ابھی تک اس کے متعلق کوئی مستند بیان میری نظر سے نہیں گذرا لیکن فرض کر لیجئے کہ اس قسم کی مشکلات موجود ہیں اس کے یہ معنی تو نہیں کہ حکومت ہند اس امید افزا صوبے کو اپنی آزادانہ ترقی کی جدوجہد میں عارضی طور پر مدد نہ دے۔

رہا شمال مغربی سرحدی صوبہ۔۔ سو یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ ارکان کمیشن نے عملاً اس امر سے انکار کر دیا ہے کہ اس صوبے کے باشندوں کو بھی اصلاحات کا حق حاصل ہے۔ ان کی سفارشات

برے (Bray) کمیٹی سے بھی کم ہیں اور وہ جس کونسل کی تجویز پیش کرتے ہیں وہ چیف کمشنر کی مطلق العنانی کے لیے محض ایک آڑ کا کام دے گی۔ افغانوں کا یہ پیدائشی حق کہ وہ سگرٹ روشن کر سکیں محض اس لیے سلب کر لیا گیا ہے کہ وہ ایک بارود خانے میں رہتے ہیں۔ ارکان کمیشن کی یہ دلیل کس قدر بھی لطیف کیوں نہ ہو اس سے کسی جماعت کا اطمینان نہیں ہو سکتا۔ سیاسی اصلاحات کی مثال روشنی کی سی ہے نہ کہ آگ کی اور ہمارا فرض ہے کہ ہم تمام انسانوں کو یہ روشنی پہنچائیں خواہ وہ خانہ بارود میں رہتے ہوں یا کوئلے کی کان میں۔ افغان ایک بہادر اور ذہین قوم ہے۔ وہ اپنے مقاصد کے لیے ہر قسم کی تکلیف برداشت کر سکتے ہیں۔ وہ ہر ایسی کوشش کی شدت سے مزاحمت کریں گے جو ان کو آزادانہ ترقی کے حق سے روک دے۔ ان لوگوں کو مطمئن رکھنا ہندوستان اور انگلستان دونوں کے لیے مفید ہے۔ گزشتہ ایام میں اس بد قسمت صوبے میں جو المناک واقعات پیش آ چکے ہیں وہ محض اس امتیازی اور غیر ہمدردانہ سلوک کا نتیجہ ہیں جو ہندوستان میں اصول حکومت خود اختیاری کے نفاذ سے لے کر روا رکھا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ برطانوی مدبرین صحیح حالات کا اندازہ کرنے میں غلطی نہیں کریں گے اور وہ اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا نہیں رکھیں گے کہ اس صوبے میں جو کچھ پیش آ رہا ہے خارجی اثرات کا نتیجہ ہے۔

حکومت ہند نے بھی اپنی یادداشت میں صوبہ سرحدی کے لیے جن اصلاحات کی سفارش کی ہے وہ ناکافی ہیں۔ بے شک ان کا دائرہ کمیشن کی سفارشات سے وسیع ہے کیونکہ اس میں ایک طرح کی منتخب کونسل اور نیم منتخب کابینہ کی تجویز کی گئی ہے لیکن حکومت ہند نے بھی اس صوبے کو وہ سیاسی درجہ نہیں دیا جو دوسرے صوبوں کو حاصل ہے۔ حالانکہ افغان جبلتاً" اس بات کے کہیں زیادہ اہل ہیں کہ ہندوستان کے دوسرے باشندوں کی نسبت جمہوری ادارات میں حصہ لیں۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس

میرا خیال ہے کہ اب مجھے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے متعلق چند سرسری اشارات کر دینا چاہیے۔ ذاتی طور سے مجھے اس کانفرنس سے کوئی امید وابستہ نہیں البتہ یہ ضرور تصور کیا جاتا تھا کہ فرقہ وارانہ تنازعات کے رزمگاہ سے دور ایک بدلی ہوئی فضا میں لوگ کہیں زیادہ ہوشمندی سے کام لیں گے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ واقعات اس کے بالکل برعکس ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فرقہ وارانہ مسائل پر جو بحث لندن میں ہوئی ہے اس میں مسلمانوں اور ہندوؤں کا تمدنی اختلاف اور بھی زیادہ واضح ہو گیا۔ بایں ہمہ وزیراعظم انگلستان کو اس امر سے انکار ہے کہ ہندوستان کا مسئلہ بین الاقوامی ہے قومی نہیں۔ انہوں نے کہا ہے۔ "یہ ایک دشوار بات ہو گی کہ میری حکومت پارلیمنٹ کے سامنے جداگانہ انتخابات کی تجاویز پیش کرے، اس لیے کہ مخلوط انتخابات انگریزوں کے جذبات جمہوریت پسندی کے زیادہ قرین ہیں۔" انہوں نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ ایک ایسے ملک میں جہاں متعدد قومیں آباد ہوں برطانوی جمہوریت کی صورت قائم نہیں ہو سکتی۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ اس مسئلہ کو جغرافیائی اصول پر حل کیا

جائے۔ جداگانہ انتخابات کو قائم رکھنا اس کا کوئی عمدہ بدل نہیں ہے۔ مجھے یہ بھی امید نہیں کہ اقلیتوں کی سب کمیٹی کسی صحیح نتیجے پر پہنچے۔ آخر الامر سارا مسئلہ برطانوی پارلیمنٹ میں پیش ہو گا۔ ہمیں امید ہے کہ انگریز قوم کے بالغ نظر نمائندے اس مسئلے کو محض سطحی نگاہوں سے نہیں دیکھیں گے' جیسا کہ اب تک ہندوستان کے اکثر ارباب سیاست نے کیا ہے بلکہ ان کی نگاہیں اس معاملہ کی تہ تک ہندوستان کے اکثر ارباب سیاست نے کی ہے۔ ہر وہ دستور جو اس تصور پر مبنی ہو گا کہ ہندوستان میں ایک ہی قوم بستی ہے یا جن کا مقصد یہ ہو کہ یہاں ان اصولوں کا نفاذ کیا جائے جو برطانیہ کے جذبات جمہوریت پسندی کا نتیجہ ہیں' اس کا مطلب صرف اسی قدر ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کو نادانستہ خانہ جنگی کے لیے تیار کیا جائے۔ جہاں تک میری سمجھ کام کرتی ہے اس ملک میں اس وقت تک امن و سکون قائم نہیں ہو سکتا جب تک اس امر کو تسلیم نہ کر لیا جائے کہ ہندوستان کی ہر ملت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کیے بغیر جدید صوبوں پر آزادی کے ساتھ ترقی کرے۔

مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ہمارے مسلمان مندوبین کو اس مسئلے کے صحیح حل کی اہمیت کا پورا پورا احساس ہے جس کو ہم نے ہندوستان کا بین الاقوامی مسئلہ کہا ہے۔ ان کا یہ اصرار بالکل بجا ہے کہ مرکزی حکومت میں ذمہ داری کا مسئلہ طے کرنے سے پہلے فرقہ وارانہ تنازعات کا تصفیہ ہو جانا ضروری ہے۔ کسی مسلمان سیاسی رہنما کو اس طعن آمیز لفظ (یعنی لفظ "فرقہ واری") کا مطلق خیال نہیں کرنا چاہیے جسے ہندو محض پراپیگنڈا کی خاطر استعمال کر رہے ہیں تاکہ بقول وزیراعظم وہ انگلستان کی جذبات پسندی سے فائدہ اٹھا سکیں اور انگریز غلطی سے یہ فرض کر لیں کہ ہندوستان کی واقعی وہ حالت ہے جو اصل میں ہے نہیں۔ اس وقت بڑے بڑے مقاصد خطرے میں ہیں۔ ہماری تعداد سات کروڑ ہے اور ہم ہندوستان کے دوسرے باشندوں کی نسبت کہیں زیادہ یکرنگ قوم ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ہندوستان میں کوئی قوم بستی ہے تو وہ مسلمان ہی ہیں۔ اگرچہ ہندو ہر بات میں ہم سے آگے ہیں لیکن ابھی تک ان کو وہ یک رنگی حاصل نہیں ہوئی جو ایک قوم بننے کے لیے ناگزیر ہے اور جو اسلام نے از خود آپ کو عطا کی ہے۔ بیشک ہندو اس امر کے لیے مضطرب ہیں کہ وہ ایک قوم بن جائیں مگر قوموں کی ترکیب گویا ایک نئی زندگی میں قدم رکھنا ہے اور جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے کہ وہ اپنے تمام نظام معاشرت کو یک قلم بدل دیں۔ ایسے ہی مسلمان رہنماؤں اور ارباب سیاست کو اس لطیف مگر مغالطہ انگیز دلیل سے بھی متاثر ہونا نہیں چاہیے کہ ترکی' ایران اور دوسرے اسلامی ممالک قوم پسندی کے اصولوں پر گامزن ہیں۔ مسلمانان ہندوستان کی حالت ان سے بالکل مختلف ہے۔ ان ممالک کی ساری آبادی تقریباً مسلمانوں کی ہے اور جو اقلیتیں باقی رہ جاتی ہیں ان کا تعلق بہ اصطلاح قرآنی اہل کتاب سے ہے۔ مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان کوئی معاشرتی دیوار حائل نہیں۔ اگر کوئی یہودی' عیسائی یا زرتشتی (یعنی پارسی) کسی مسلمان کا کھانا چھو لے تو وہ نجس نہیں ہو جاتا۔ شریعت اسلامی کی رو سے ان میں باہم مناکحت جائز ہے۔ حقیقت میں یہ وہ اولین قدم تھا جو اسلام نے عملاً اتحاد بنی نوع انسانی کی خاطر اٹھایا۔ اس نے ان لوگوں کو جن کا اخلاقی نصب العین تقریباً ایک سا تھا

باہم مل جانے کی دعوت دی- قرآن پاک کا ارشاد ہے:

یا اہل لکتاب تعالو الیٰ کلمۃ (یعنی توحید) سواء بیننا و بینکم- یہ الگ بات ہے کہ مسلمان اور عیسائی اقوام کے باہمی جنگ و جدل اور پھر مغرب کی چیرہ دستیوں نے اس امر کا موقع نہیں دیا کہ دنیائے اسلامی اس آیت کے لا انتہا معنوں کو عمل میں لاتی- بہر حال آج بلاد اسلامیہ میں یہ مقصد اسلامی قومیت کی شکل میں پورا ہو رہا ہے-

مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہم اپنے مندوبین کی کامیابی کا اندازہ صرف اس ایک امر سے کر سکتے ہیں کہ وہ کانفرنس کے غیر مسلم مندوبین سے قرار داد دہلی کے مطالبات کہاں تک منوا لیتے ہیں- اگر ان مطالبات کو مسترد کر دیا گیا تو ایک نہایت ہی اہم اور عظیم الشان سوال پیدا ہو گا- اس وقت ضرورت ہو گی کہ ہندوستان کے مسلمان ایک ہو کر واقعی سنجیدگی سے قائم ہیں تو آپ کو اس قسم کے عمل کے لیے تیار رہنا چاہیے- ہمارے سربرآوردہ لوگوں نے کافی غور و خوض سے کام لیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک حد تک یہ انہیں کے غور و فکر کا نتیجہ ہے کہ ہم لوگ ان قوتوں سے آشنا ہوئے ہیں جو ہندوستان کے اندر اور اس کے باہر ہماری آئندہ قسمتوں کی تشکیل میں کار فرما ہیں- لیکن میں آپ سے اس قدر پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اس غور و فکر نے ہم میں اتنی قابلیت پیدا کر دی ہے کہ اگر مستقبل قریب میں ضرورت پیش آئے تو ہم اپنے آپ کو اسی قسم کے عمل کے لیے تیار پائیں' جو حالات کا تقاضا ہو؟ مجھے آپ سے بلا تکلف کہہ دینا چاہیے کہ ہندوستان کے مسلمان اس وقت دو عوارض کا شکار ہو رہے ہیں' پہلا عارضہ یہ ہے کہ ہم میں شخصیتوں کا وجود نہیں- سر ما لکم ہیلی اور لارڈ اروِن کی تشخیص بالکل صحیح تھی جب انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ملت اسلامیہ نے کوئی رہنما پیدا نہیں کیا- رہنماؤں سے میرا مطلب وہ افراد ہیں جن کو عنایت ایزدی یا وسیع تجربات کی بدولت ایک طرف یہ ادراک حاصل ہو کر اسلامی تعلیمات کی روح اور اس کی تقدیر کیا ہے' دوسری طرف ان میں یہ صلاحیت موجود ہو کہ وہ جدید حوادث کی رفتار کا اندازہ صحت کے ساتھ کر سکیں- یہی لوگ ہیں جن پر کسی قوم کی قوت عمل کا انحصار ہوتا ہے- دوسرا مرض جو مسلمانوں کے اندر گھر کر چکا ہے یہ ہے کہ ان میں اطاعت کا مادہ باقی نہیں رہا- یہی وجہ ہے کہ آج متعدد افراد اور متعدد جماعتیں الگ الگ راہوں پر گامزن ہیں اور اس سے قوم کے عام افکار اور اس کی سرگرمیوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا- جو طرز عمل ہم نے مذہب میں اختیار کر رکھا تھا اب وہی سیاسیات میں ہو گیا ہے- لیکن مذہبی فرقہ بندیوں سے اتنا نقصان نہیں پہنچتا اس لیے کہ ان سے کم از کم اتنا تو ظاہر ہوتا ہے کہ ہمیں اس اصول سے دلچسپی ہے جس پر ہماری ترکیب کا انحصار ہے- مزید برآں یہ اصول اس قدر وسیع ہے کہ کسی فرقے کو اس قدر جرات نہیں ہو سکتی کہ وہ اسلام کی حدود ہی سے باہر نکل جائے- برعکس اس کے اگر سیاسی زندگی میں اختلافات کو جائز رکھا گیا' بالخصوص اس وقت جب مفاد ملت کی خاطر اتحاد عمل کی ضرورت ہے' تو اس کا نتیجہ سوائے ہلاکت کے اور کچھ نہیں ہوگا- لہٰذا سوال یہ ہے کہ ان دونوں امراض کے علاج کی صورت کیا ہے- اول الذکر کا تدارک ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے- البتہ

جہاں تک دوسری بیماری کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ ہم اس کا دفعیہ کر سکتے ہیں۔ میں نے اس موضوع پر ایک خاص رائے قائم کر رکھی ہے لیکن بہتر ہو گا کہ میں اس وقت تک اس کا اظہار نہ کروں جب تک کہ ایسی صورت حالات پیدا نہ ہو جائے جس کا خطرہ ہے۔ خدانخواستہ اگر ایسا ہوا تو تمام سربر آوردہ مسلمانوں کا' خواہ' ان کے خیالات کچھ بھی ہوں فرض ہو گا کہ وہ ایک جگہ جمع ہوں اور صرف قراردادیں ہی منظور نہیں کریں بلکہ اپنے مقاصد میں حقیقی کامیابی کے حصول کے لیے مسلمانوں کے سامنے کوئی راہ عمل پیش کریں۔ میں نے اس امر کا تذکرہ صرف اس لیے کر دیا ہے کہ آپ نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کریں۔

خاتمہ سخن

حضرات مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا کر چکا۔ آخر میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ مسلمانان ہند اس وقت اپنی زندگی کے جس نازک دور میں سے گذر رہے ہیں اس کے لیے کامل تنظیم اور اتحاد عزائم و مقاصد کی ضرورت ہے۔ ہمارے ملی وجود کی بقا اور ہندوستان کا مفاد صرف اسی ایک امر سے وابستہ ہے۔ ہندوستان کی سیاسی غلامی تمام ایشیا کے لیے لامتناہی مصائب کا سرچشمہ ہے۔ اس نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے اور اسے اظہار ذات کی اس مسرت سے محروم کر دیا ہے جس کی بدولت کبھی اس میں ایک بلند اور شاندار تمدن پیدا ہوا تھا۔ ہم پر ایک فرض ہندوستان کی طرف سے عائد ہوتا ہے جو ہمارا وطن ہے اور جس میں ہمیں جینا اور مرنا ہے اور ایک فرض ایشیا بالخصوص اسلامی ایشیا کی جانب سے اور چونکہ ایشیا کے دوسرے اسلامی ممالک کی نسبت ایک ہی ملک میں سات کروڑ مسلمانوں کی موجودگی پر محض اسلامی زاویہ نگہ ہی سے نہیں بلکہ ہندی مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے غور کریں۔ ایشیا اور ہندوستان کی طرف سے ہم پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان کی بجا آوری اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم اپنے ارادوں کو ایک مخصوص مقصد پر جمع نہیں کر لیں گے۔ اگر آپ ہندوستان کی دوسری ملتوں کے درمیان اپنا وجود قائم رکھنا چاہتے ہیں تو آپ کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں۔ ہماری بے نظم اور منتشر حالت کے باعث بہت سے ایسے سیاسی مصالح جو ہماری زندگی کے لیے ناگزیر ہیں' دن بدن پیچیدہ ہو رہے ہیں۔ میں فرقہ وارانہ مسائل کے تصفیے سے مایوس نہیں ہوں لیکن میں آپ سے اپنے اس احساس کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتا کہ موجودہ نازک حالات کے تدارک کے لیے ہماری ملت کو مستقبل قریب ہی میں آزادانہ جد وجہد کرنا پڑے گی۔ لیکن کسی سیاسی طرز عمل کے لیے آزادانہ جد وجہد کرنا اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب پوری قوم اس پر آمادہ ہو اور ان کے تمام عزائم اور ارادے ایک ہی مقصد پر مرکز ہو جائیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم لوگوں کے اندر بھی وہ اشتراک عزم پیدا ہو جائے جس کا ازخود نشوونما ہوتا ہے؟ کیوں نہیں۔ فرقہ بندی کی ہوس اور نفسانیت کی قیود سے آزاد ہو جائیے اور پھر اس نصب العین کی روشنی میں جو آپ کی طرف منسوب ہے اپنے انفرادی اور اجتماعی اعمال کی قدر و قیمت کا اندازہ کیجئے خواہ وہ مادی اغراض ہی سے متعلق کیوں نہ

ہوں۔ مادیات سے گذر کر روحانیات میں قدم رکھیے۔ مادہ کثرت ہے لیکن روح نور ہے' حیات وحدت ہے۔ ایک سبق جو میں نے تاریخ اسلام سے سیکھا ہے یہ ہے کہ یہ صرف اسلام تھا جس نے آڑے وقتوں میں مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا نہ کہ مسلمان۔ اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں ازسرنو جمع ہو جائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائے گا۔ قرآن مجید کی ایک نہایت معنی خیز آیت یہ ہے کہ کہ ہمارے نزدیک ایک پوری ملت کی موت و حیات کا سوال ایسا ہی ہے جیسے ایک نفس واحد کا۔ پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم مسلمان جو بجا طور پر یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ ہمیں تھے جو سب سے پہلے انسانیت کے اس بلند اور ارفع تصور پر عمل پیرا ہوئے ایک نفس واحد کی طرح زندہ رہیں۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ ہندوستان کی حالت وہ نہیں جیسی کہ نظر آتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں کسی شخص کو حیرت میں ڈالنا چاہتا ہوں۔ بہرحال اس کے صحیح معنے آپ پر اسی وقت آشکارا ہو سکیں گے جب آپ ان کے مشاہدے کے لیے ایک صحیح اجتماعی انا پیدا کر لیں گے۔ علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اهتدیتم (۱۰۴:۵)۔

مترجم سید نذیر نیازی

(رسالہ صوفی جلد ۴۵' شمارہ ۴' اپریل ۱۹۳۱ء)

مظفر حسین آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس کے ان سات اساسی ارکان میں سے ہیں جنھوں نے ۱۹۶۶ میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی رہنمائی میں اس ادارہ کی بنیاد رکھی تھی۔ بسلسلہ ملازمت آپ محکمہ زراعت سے منسلک رہے جس میں سے بطور ڈائریکٹر ریسرچ انفارمیشن زرعی تحقیقاتی کونسل وزارت خوراک و زراعت، حکومت پاکستان ایک سال بطور ڈائریکٹر ایگریکلچرل انفارمیشن پنجاب دس سال اور بطور ممبر کسان کمشن حکومت پنجاب ڈھائی سال خدمات انجام دیں۔ عمر بھر آپ کو اقبالیات سے گہرا شغف رہا ہے۔ آپ کے مقالات "اقبال ریویو" "اقبال" "اسلامی تعلیم" میں شائع ہوتے رہے ہیں اور اقبال اکیڈمی پاکستان نے آپ کی ایک کتاب "علامہ اقبال کے زرعی افکار" شائع کی ہے۔ آج کل آپ آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس کے اکیڈمک اینڈ ایڈمنسٹریٹو ڈائریکٹر ہیں۔

آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس